۲۸

فتنوں سے بچنے کیلئے سورۂ فاتحہ میں علاج بتایا گیا ہے

(فرمودہ ۳؍ستمبر ۱۹۳۷ء)

تشہّد ،تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

سورۂ فاتحہ ایک ایسی کامل سورۃ ہے کہ جس میں ہر مرض کا علاج موجود ہے اور ہر زمانہ کے شرور اور فِتن کا ذکر اس میں پایا جاتا ہے اور ہر قسم کی روکیں جو انسانی ترقی کے راستہ میں حائل ہوتی ہیں یا وہ اسباب جو خدا تعالیٰ کے قُرب سے اسے دور کر دیتے ہیں ان کے ازالہ کے ذرائع اور ان سے بچنے کے سامانوں کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ جس طرح قرآن کریم ایک انڈیکس اور فہرست ہے اللہ کے ان قوانین کی جو اِس تمام کائنات کو چلا رہے ہیں اسی طرح سورۂ فاتحہ فہرست ہے قرآن کریم کے مضامین کی۔ جس طرح ایک زکی انسان محض فہرست پڑھ کر اصل کتاب کے مضامین سے آگاہ ہو جاتا ہے اسی طرح قرآن کریم سے تعلق رکھنے والا انسان سورۂ فاتحہ پڑھ کر قرآن مجید کے تمام مضامین سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر قرآن مجید پڑھ کر جو اللہ تعالیٰ کے اُن قوانین کی فہرست ہے جو تمام کائناتِ عالَم کو چلا رہے ہیں اس کے قوانین قدرت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

چونکہ موجودہ زمانہ کئی قسم کے فِتن کا زمانہ ہے اس لئے میں جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ فِتنوں کے زمانوں کے متعلق قرآن کریم میں بعض احکام بیان کئے گئے ہیں اور بعض ایسی تدابیر بتائی گئی ہیں جن کو اختیار کر کے انسان فِتن سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ بِالخصوص سورۂ فاتحہ میں اصولی طور پر اللہ تعالیٰ نے فتن کی تفصیلات بتائی ہیں اور ان سے بچنے کا علاج بھی بتایا ہے۔ مگر ہماری جماعت

کے بعض دوست ان امور کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے بسا اوقات اس بات پر حیران ہو جاتے ہیں کہ ہماری جماعت میں بھی بعض منافق پائے جاتے ہیں۔ اور ہماری جماعت میں سے بھی بعض لوگ مختلف مواقع پر ٹھوکر کھاتے اور مرتد ہو جاتے ہیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ ان کیلئے یہ صورت حیرت انگیز ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر وہ سورۂ فاتحہ پر غور کریں تو انہیں معلوم ہو کہ اس ابتدائی سورت میں ہی جو ہمیں دعا سکھائی گئی ہے اس میں بھی اس امر کو بیان کر دیا گیا ہے کہ ایسے فتن ہمیشہ آتے رہیں گے اور مومنوں کی جماعت سے وہ لوگ نکلتے رہیں گے جو منافق طبع ہوں۔

جیسا کہ عربی زبان سے واقف لوگ جانتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ[1] کی دعا جو ہمیں سکھائی گئی ہے یہ مستقل دعا نہیں۔ عام طور پر جو لوگ عربی زبان سے یا قرآن کریم کے مطالب سے ناواقف ہوتے ہیں وہ سورہ فاتحہ کی ان آخری آیتوں کے صرف یہ معنے سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں یہ سکھایا ہے کہ ہم اس سے انعامات کے حصول کی دعا کریں اور پھر یہ بھی دعا کریں کہ اُس کا غضب ہم پر نازل نہ ہو اور نہ ہم گمراہ ہوں۔ حالانکہ یہ مفہوم ان آیتوں کا نہیں بلکہ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اِس بات پر زور دیا ہے اور جیسا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل اِس بات پر زور دیا کرتے تھے اور جیسا کہ عربی زبان کے قواعد سے ہر واقف شخص جانتا ہے کہ اس میں جو دعا سکھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ الٰہی! ہم پر تُو اپنا انعام نازل کر مگر انعام کے بعد جو تیرا غضب نازل ہوتا ہے یا منعم علیہ گروہ میں شامل ہو کر انسان بعض دفعہ جو ضّال بن جاتا ہے اس سے ہمیں بچا اور ہمیں مغضوب اور ضالین میں شامل ہونے سے محفوظ رکھ۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کی دعا اگر مستقل ہوتی تو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ[2] کی دعا سے پہلے اسے لکھا جاتا۔ کیونکہ پہلے انسان اللہ تعالیٰ کے غضب سے بچتا اور گمراہی سے محفوظ ہوتا ہے اور بعد میں اسے انعام ملتا ہے۔ ایسا نہ کیا جاتا کہ پہلے تو اس سے ہدایت طلب کروائی جاتی اور پھر کہا جاتا کہ اب یہ بھی دعا مانگو کہ ہم پر غضب نازل نہ ہو۔ مثلاً ایک طالب علم جب امتحان میں کامیابی کے متعلق دعا کرے گا تو یُوں دعا کرے گا کہ یا اللہ! مجھے روزانہ سبق یاد ہوتے رہیں اور پھر امتحان میں بھی میں پاس ہو جاؤں۔ کیونکہ امتحان سبقوں کے بعد آتا ہے پہلے نہیں آتا۔ اور اگر کوئی طالب علم یہ دعا کرے کہ یا اللہ! میں امتحان میں پاس ہو جاؤں اور پھر سبق بھی مجھے یاد ہوتے رہیں تو سب لوگ اُس کی اِس دعا پر ہنسیں گے اور کہیں گے کہ پہلے تمہیں سبق یاد ہونے چاہئیں اس

کے بعد تم امتحان میں کامیاب ہو گے نہ یہ کہ امتحان میں کامیاب ہو جاؤ اور پھر سبق یاد کرنے لگو۔ پس تم پہلے یہ دعا مانگو کہ الٰہی ! مجھے روزانہ سبق یاد ہوتے رہیں اور پھر یہ دعا مانگو کہ مجھے امتحان میں کامیاب بھی کر۔ امتحان میں کامیابی کی دعا اس لئے ضروری ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ سبق یاد ہونے پر انسان امتحان میں بھی ضرور کامیاب ہو جائے۔ بعض دفعہ سبق اچھی طرح یاد ہوتے ہیں مگر کمرۂ امتحان میں داخل ہوتے ہی طالب علم گھبرا جاتے ہیں اور انہیں سب کچھ بُھول جاتا ہے اور وہ فیل ہو جاتے ہیں۔ پس سبقوں کے یاد رہنے کی دعا کے ساتھ ہی یہ دعا مانگنی بھی ضروری ہوتی ہے کہ الٰہی ! پھر میں امتحان میں بھی کامیاب ہو جاؤں۔

مجھے یاد ہے جب میں سکول میں پڑھا کرتا تھا تو مولوی شیر علی صاحب جو ہمارے استاد ہؤا کرتے تھے وہ ایک طالب علم کو تمام لڑکوں کی کاپیاں دیکھنے کیلئے مقرر کیا کرتے تھے۔ وہ انگریزی میں نہایت اعلیٰ مہارت رکھتا تھا اور ہمارے اساتذہ اُسی کو ہماری کاپیاں دیکھنے کیلئے مقرر کیا کرتے تھے۔ مگر جب امتحان ہوتا تو وہ استاد طالب علم جو دوسروں کی کاپیاں دیکھا کرتا تھا فیل ہو جاتا اور اس کے شاگرد پاس ہو جاتے۔ جب اُس سے پوچھا جاتا کہ یہ کیا بات ہے؟ تو وہ کہتا جب میں امتحان کے کمرہ میں داخل ہوتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں اور سب پڑھا لکھا مجھے بُھول جاتا ہے۔ تو یہ تو ممکن ہے کہ کوئی انسان سبق یاد کرتا رہے مگر امتحان کے وقت گھبرا جائے اور سوالات کے جواب نہ دے سکے۔ یا اسے امتحان کے دنوں میں بخار ہو جائے اور اس طرح وہ امتحان میں فیل ہو جائے۔ لیکن یہ کوئی صورت نہیں کہ کوئی طالب علم امتحان پہلے پاس کرے اور سبق بعد میں یاد کرے۔ اسی لئے جب کوئی ذہین اور سمجھدار طالب علم دعا کرے گا تو اسی رنگ میں کرے گا کہ یا اللہ ! مجھے سبق یاد ہوتے رہیں اور پھر امتحان میں بھی مَیں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ نہیں کہے گا کہ یا اللہ ! میں امتحان میں کامیاب ہو جاؤں اور پھر سبق مجھے یاد ہوتے رہیں۔ کیونکہ یہ پہلی دعا ہے اور وہ پچھلی۔ اور پہلی دعا کو پیچھے کرنا اور پچھلی دعا کو پہلے رکھنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔ تو ہدایت ملنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل نہ ہو۔ کیونکہ جس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو گیا اسے ہدایت کہاں مل سکتی ہے اور پھر ہدایت ملنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان گمراہی سے بچا ہؤا ہو۔ کیونکہ جو گمراہ ہو اس کا ہدایت سے کیا تعلق ہے۔ تو اگر یہ مستقل دعائیں ہوتیں تو سورۂ فاتحہ میں یوں دعا مانگی جاتی کہ یا اللہ ہم گمراہ نہ ہوں۔ یا اللہ ! ہم پر تیرا غضب نازل نہ ہو

اور یا اللہ! ہم ہمیشہ صراطِ مستقیم پر چلنے والے ہوں۔ یہ ترتیب بالکل طبعی تھی کیونکہ پہلے انسان کمزوریوں سے نجات حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے اور پھر یہ چاہتا ہے کہ میں کامل انسان بن جاؤں۔ جب ایک بیمار دعا کرے گا تو یُوں کرے گا کہ یا اللہ! مجھے بیماری سے شفا بخش اور مجھے طاقت عطا فرما۔ کیونکہ پہلے اس کی بیماری دور ہوگی اور پھر اس میں طاقت آئے گی۔ اسی طرح خدا کا غضب اور ضلالت بیماریاں ہیں اور اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کی دعا قوت اور طاقت کی دعا ہے۔ اور کوئی عقلمند یہ دعا کبھی نہیں کرے گا کہ پہلے میں پہلوانوں کی طرح مضبوط بن جاؤں اور پھر میری بیماریاں دور ہوں۔ وہ یہی دعا کرے گا کہ پہلے میری بیماریاں دور ہوں اور پھر میرے اندر پہلوانوں کی سی طاقت آجائے۔ تو اگر یہ تینوں مستقل دعائیں ہوتیں تو غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ کو پہلے رکھا جاتا اور اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ [۳] کو بعد میں۔ مگر یہ مستقل دعائیں نہیں بلکہ ساری دعائیں مل کر ایک کامل دعا بنتی ہے۔ چنانچہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ میں سیدھا راستہ اللہ تعالیٰ سے طلب کیا گیا ہے اور اس دعا کے اندر ہی وہ ضلالت جو ایمان سے پہلے ہوتی ہے اس کے دور ہونے کی دعا شامل ہے۔ مثلاً اگر کوئی بیمار صرف یہ دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! مجھے مضبوطی اور طاقت عطا کر تو بیماری کے دور ہونے کی دعا خود بخود اس میں آجائے گی۔ ہاں اگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ الفاظ بھی بڑھا دے کہ پھر کبھی میں بیمار نہ ہوں تو بڑھا سکتا ہے کیونکہ یہ آئندہ کے متعلق ہوگی۔ اس کی موجودہ بیماری کے دور ہونے کی دعا اس کے پہلے فقرہ میں ہی آجائے گی۔ تو اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ میں جس کے معنے یہ ہیں کہ یا اللہ! مجھے کامل صحت دے، یا اللہ! مجھے کامل قوت دے وہ ضلالت جو ایمان سے پہلے ہوتی ہے اور وہ غضب جو عدمِ ہدایت کی صورت میں نازل ہوتا ہے اس سے بچنے کی دعا خود بخود آگئی۔ مگر پھر ایمان کے بعد بھی کبھی انسان ضلالت اور گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ایمان کے بعد بھی کبھی انسان اللہ تعالیٰ کے غضب کا مورد ہو جاتا ہے۔ پس اس غضب اور اس ضلالت سے بچنے کی دعا ان آخری آیتوں میں سکھائی گئی ہے اور مومنوں کو تلقین کی گئی ہے کہ تم یہ دعا کرو کہ یا اللہ! ہماری بیماریوں کو دور کر اور ہمیں اپنے فضل سے کامل روحانی صحت دے۔ مگر پھر اس صحت کی وجہ سے جو بعض خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور انسان اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہو جاتا ہے اور کبھی ضلالت اس پر غالب آجاتی ہے اور وہ گمراہ ہو جاتا ہے، ان تمام خرابیوں سے تا عمر اور تا اختتامِ حیات ہمیں محفوظ رکھ اور صراطِ مستقیم پر ثبات

عطا فرما۔ تو غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَاالضَّالِّیْنَ سے مراد موجودہ بیماریوں کے دور ہونے کے لئے دعا نہیں بلکہ جب ایمان کامل ہو جائے تو اس کے بعد پیدا ہونے والی خرابیوں کے ازالہ کیلئے یہ دعا ہے کہ الٰہی! ہمیں ایمان تو حاصل ہو گیا مگر اب ایسا فضل کر کہ ہمارا ایمان کبھی زائل نہ ہو اور ہم مرتے دم تک اسی پر قائم رہیں۔ غرض غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَاالضَّالِّیْنَ استثناء ہے۔ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ سے کہ بعض منعم علیہ ہو کر مغضوب ہو جاتے ہیں اور بعض منعم علیہ ہو کر ضال ہو جاتے ہیں اور دعا یہ سکھائی گئی ہے کہ الٰہی! جب ہم منعم علیہ گروہ میں شامل ہو جائیں تو پھر ہم منعم علیہ ہی رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی ٹھوکر کی وجہ سے مغضوب اور ضالّین میں شامل ہو جائیں۔

یہ دعا ہے جو ہم ہمیشہ مانگتے رہتے ہیں اور جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ عام مومن تو کُجا منعم علیہ شخص بھی مغضوب اور ضالّ ہونے کے خطرہ میں ہر وقت گھرا ہوا ہے اور بعض دفعہ انسان روحانی لحاظ سے بہت بلند مقام پر پہنچ کر بھی ایسا گرتا ہے کہ اس کے اندر ایمان کا شائبہ تک نہیں رہ جاتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لدھیانہ کے ایک شخص کے متعلق جو آپ سے نہایت گہری ارادت ظاہر کرتا تھا ایک دفعہ ایک الہام ہوا جس میں اس کی روحانی طاقتوں کی بہت بڑی تعریف کی گئی تھی۔ مگر بعد میں وہ مرتد ہو گیا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ اس کے متعلق تو الہامِ الٰہی میں تعریف آ چکی تھی پھر یہ کیوں مرتد ہو گیا۔ تو آپ نے فرمایا بے شک الہام میں اس کی تعریف موجود تھی اور اللہ تعالیٰ کا کلام بتا رہا تھا کہ وہ اعلیٰ روحانی طاقتیں رکھتا تھا۔ لیکن جب اس نے ان طاقتوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس میں کبر اور غرور پیدا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہو گیا اور وہ مرتد ہو گیا۔ تو سورۂ فاتحہ کی دعا ہمیں بتاتی ہے کہ نِفاق اور کفر یہ دو چیزیں انسان کے ساتھ ہر وقت لگی ہوئی ہیں اور یہ دونوں مرضیں منعم علیہ گروہ میں شامل ہونے کے بعد انسان پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کے پیدا ہونے کے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک مرض تو اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ اس کے فضل اسے نوازنا شروع کرتے ہیں اور وہ ایمان میں اعلیٰ درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن بجائے اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر گزار ہونے کے وہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کسی وقت خدا تعالیٰ کی یا اس کے پیاروں اور مقبول بندوں کی کوئی ایسی گستاخی کر بیٹھتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ تمام انعامات سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے نیچے آ جاتا ہے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ

یا اس کے پیاروں سے لڑائی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ تمام درجات سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا غضب اس پر نازل ہو جاتا ہے۔ یا پھر یہ مرض اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ غلو کرنے لگ جاتا ہے اور ایسی جگہ انکسار کرنے لگ جاتا ہے جہاں اس کیلئے انکسار جائز نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں اس کے اندر تکبر نہیں ہوتا بلکہ انکسار ہوتا ہے اور انکسار بھی جب حد سے بڑھ جائے تو ایک مقام پر جُرم بن جاتا ہے۔ پس انکسار اس کو ایک ایسے مقام پر لے جاتا ہے جو ضلالت اور گمراہی کا مقام ہوتا ہے اور اس طرح خدا تعالیٰ کی نگاہ سے وہ گر جاتا ہے۔ مثلاً خدا کے کسی برگزیدہ کے متعلق وہ یہ خیال کرنے لگ جاتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں مَیں اتنا ذلیل ہوں، اتنا ذلیل ہوں کہ مجھے اب اس کی پوجا کرنی چاہئے اور میں تو بالکل ادنیٰ انسان ہوں، یہ شخص جس کی میں اطاعت کرتا ہوں خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ جب انکسار کو وہ اس حد تک پہنچا دیتا ہے تو وہ ضال کہلانے لگ جاتا ہے۔ اور ایسا انسان بھی انعام کے مقام پر پہنچ کر گر جاتا ہے۔ پہلی قوم کی مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے دی اور دوسری قوم کی مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاریٰ سے دی۔ یہود وہ تھے جنہوں نے خدا تعالیٰ کے انبیاء کے مقابلہ میں تکبر سے کام لیا اور نصاریٰ وہ تھے جنہوں نے خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے مقابلہ میں اس قدر انکسار کیا کہ اسے خدا اور خدا کا بیٹا سمجھنے لگ گئے اور آپ اس کے بندے بن بیٹھے۔ پہلی قوم محبت توڑ کر خدا تعالیٰ کی مجرم بنی تھی تو دوسری قوم محبت کی بے جا زیادتی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے حضور مجرم قرار پا گئی۔ ۱۹۳۵ء میں مَیں نے اسی مسجد میں اسی ممبر پر کھڑے ہو کر ایک رؤیا سنایا تھا جو انہیں دنوں ''الفضل'' میں بھی شائع ہو گیا اور جس کے ایک حصہ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ ناجائز محبت انسان کو مجرم بنا دیتی ہے۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کبڈی کھیلنے لگے ہیں اور انہوں نے شرط یہ باندھی ہے کہ جو جیت جائے گا، خلافت کے متعلق اس کا خیال قائم کیا جائے گا۔ جب مجھے ان کے اس خیال کا علم ہؤا تو میں نے ان پر ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ کیا تم دین کو ہنسی کا موجب بناتے ہو اور کیا ان امور کا فیصلہ کبڈیوں سے ہو سکتا ہے۔ اس پر جو لوگ پہلے خلافت کے مؤید تھے میں نے دیکھا کہ وہ بھی بھِڑ گئے اور انہوں نے میرے روکنے کو ہی اپنی ہتک سمجھا اور وہ بھی دوسرے فریق کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اب یہ ایک ناجائز محبت کا مظاہرہ تھا جو انہوں نے کیا اور بوجہ اس کے کہ انہیں خدا کیلئے محبت نہ تھی ان کے ایمان ضائع ہو گئے۔

پس اگر محبت کے جذبہ کا غلط طریق پر استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ بھی کبھی اچھا نہیں نکل سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں کے دل میں بڑا ایمان تھا، اسے سلسلہ سے بڑی محبت تھی، پھر اسے کیوں ٹھوکر لگی؟ اس کا جواب یہی ہے کہ اس کی محبت اور اس کا اخلاص خدا کیلئے نہیں تھا بلکہ کسی کمزوری یا الٰہی تصرف کے ماتحت تھا۔ اس لئے ایسے انسان باوجود محبت میں ترقی کر جانے کے پھر بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ تو انسان کے متعلق کسی مقام پر بھی یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اب ٹھوکر سے محفوظ ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ اُس اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے جہاں خدا کی طرف سے یہ کہہ دیا جائے کہ اب اسے ٹھوکر نہیں لگے گی۔ غرض اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں ہمیں اس طرف توجہ دلائی ہے اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں یہ دونوں مضمون بیان کر دیئے ہیں۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تمہارے لئے ہر قسم کی ترقیات مقدر ہیں اور تم اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات حاصل کر سکتے ہو۔ مگر دوسری طرف یہ یاد رکھو کہ جُوں جُوں انعامات بڑھتے جائیں اتنا ہی انسان کے گرنے کا بھی زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

گرتے ہیں شہسوار ہی میداں میں مثلِ برق
وہ طفل کیا کرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

کہ جو شہسوار ہو وہی میدانِ جنگ میں گرتا ہے۔ وہ بچہ جو گھٹنوں کے بل چل رہا ہو اس نے کیا گرنا ہے۔ اسی طرح انسان جتنا زیادہ اونچا چڑھتا اور روحانی کمالات حاصل کرتا چلا جاتا ہے، اُتنا ہی اس کے گرنے کا احتمال بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

یہودی کتب میں اور ہماری روایات کی کتب میں ایک شخص بلعم باعور کا حال لکھا ہے کہ اس نے بڑی عبادتیں کیں، بڑی عبادتیں کیں، بڑی عبادتیں کیں یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ کا مقرب ہو گیا اور اس کی دعائیں نہایت کثرت سے قبول ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ لوگ جب اُس کے پاس جاتے اور دعا کرنے کیلئے کہتے تو اس یقین کے ساتھ واپس آتے کہ اب یہ دعا ضرور قبول ہو جائے گی۔ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے ملک میں سے گزرے تو اس ملک کا جو بادشاہ تھا اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کیا اور آپ سے لڑائی شروع کر دی۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ میرا پلہ کمزور ہے اور میں موسیٰ کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس نے اپنے مشیر کاروں سے مشورہ لیا۔ انہوں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ بلعم کو بلاؤ اور اس سے دعا کراؤ۔ اگر وہ موسیٰ کے خلاف بددعا کرے گا تو موسیٰ کے لشکر کو ضرور شکست

ہو جائے گی۔ اس پر اس نے بلعم کی طرف اپنا آدمی بھیجا اور کہا کہ میرا موسیٰ سے مقابلہ ہے تم میرے لئے دعا کرو کہ اس مقابلہ میں مَیں کامیاب ہو جاؤں اور اگر میں جیت گیا تو میں تمہیں بہت کچھ انعام دوں گا۔ مگر پیشتر اس کے کہ بادشاہ کا آدمی اس کے پاس پہنچتا بلعم کو خدا نے خواب میں بتلا دیا کہ دیکھنا موسیٰ میرا پیارا بندہ ہے، اس کے خلاف بددعا نہ کیجیئو۔ جب بادشاہ کا پیغامبر اس کے پاس پہنچا تو چونکہ بلعم یہ خواب دیکھ چکا تھا اس لئے اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ موسیٰ کے خلاف میں بددعا نہیں کر سکتا۔ مگر اس کی بیوی نے جس کے دل میں انعام کا لالچ پیدا ہو گیا تھا اُسے کہا دیکھو! خوابوں کی مختلف تعبیریں ہوتی ہیں۔ تم انکار مت کرو اور اس کے ساتھ جاؤ اور موسیٰ کے خلاف بددعا کرو ممکن ہے ہمارے بھی دن پھر جائیں اور ہماری تنگدستی دور ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کی بات مان گیا اور گھر سے موسیٰ کے خلاف بددعا کرنے کیلئے نکلا۔ لیکن جب وہ اس شخص کے ساتھ چلا تو تین دفعہ خدا تعالیٰ کے فرشتے نے سامنے کھڑے ہو کر اسے روکا اور کہا کہ موسیٰ کے خلاف بددعا مت کر مگر وہ پھر بھی اپنی بیوی کے کہنے کے مطابق چلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک الگ مقام میں اس نے بادشاہ کے حکم کے ماتحت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بددعا کرنی شروع کر دی۔ ابھی وہ دعا کر ہی رہا تھا کہ معاً اُس پر کشفی حالت طاری ہوئی اور اس نے دیکھا کہ ایک کبوتری اُس کے منہ سے نکل کر اُڑی جا رہی ہے۔ اس نے ایک فرشتے سے پوچھا یہ کیا ہے؟ خدا کے فرشتے نے جواب دیا یہ تیرا ایمان ہے جو اَب تیرے اندر سے نکل کر اُڑا جا رہا ہے۔ اب تُو ساری عمر بیٹھا ریاضتیں کرتا رہ خدا نے تجھے جو انعام دیا تھا وہ اب اس نے واپس لے لیا ہے اور تیری تمام ولایت اس نے چھین لی ہے۔

اب دیکھو ایک شخص صاحبِ کشف ہے، صاحبِ وحی ہے، صاحبِ الہام ہے، خدا کا مقرب ہے اور اتنا مقرب ہے کہ اس کی کوئی دعا ردّ نہیں کی جاتی مگر جب وہ اس شخص کا مقابلہ کرتا ہے جسے خدا تعالیٰ نے نظام کے قائم کرنے کیلئے کھڑا کیا تھا تو اللہ تعالیٰ اس کی ساری عبادتوں کو ضائع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تیری دعا چونکہ کسی فرد کے خلاف نہیں بلکہ میرے خلاف ہے اس لئے ساری عمر کی عبادتوں کے نتیجہ میں ہماری طرف سے جو تجھے انعام ملا تھا وہ ہم واپس لیتے ہیں۔ تو معمولی مقام تو ایک طرف رہے بڑے بڑے مقام پر پہنچ کر بھی انسان بعض دفعہ ٹھوکر کھا جاتا اور ایسی بُری طرح گرتا ہے کہ اس کا ایمان بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔

اب تک ہماری جماعت میں سے جن لوگوں کو ٹھوکریں لگیں اور وہ مرتد ہوئے، ان میں سے کوئی ایسا شخص نہیں جو ایسا صاحبِ کشف اور صاحبِ الہام ہو کہ اس کے صاحبِ کشوف اور صاحبِ الہام ہونے کا جماعت کے اکثر حصہ کو علم ہو اور انہیں اس کے کشوف اور اس کے الہامات کے سچا ہونے کا تجربہ ہو۔ ایسے تو کئی ہیں جن کے دماغ میں خرابی پیدا ہوگئی اور وہ کئی قسم کے دعوے کرنے لگے مگر ان کا یہاں ذکر نہیں۔ ان کے بگاڑ کا باعث ان کے کشوف اور الہام ہی ہوئے ہیں بلکہ ان کے دماغ کا بگاڑ ان کے کشوف والہام کا موجب ہؤا ہے۔ مگر وہ لوگ جن کے کشوف اور الہامات کی جماعت گواہ ہو اور ہزاروں آدمیوں کو اس بات کا تجربہ ہو کہ انہیں خدا تعالیٰ سے خاص تعلق ہے، ایسا کوئی آدمی ہماری جماعت سے آج تک بھی مرتد نہیں ہؤا۔ ظاہری علم بالکل اور چیز ہے اگر ظاہری علم پر ہی فضیلت اور بزرگی کی بنیاد رکھی جائے تو نَعُوْذُ بِاللّٰہِ دنیا کے سارے انبیاء کو جھوٹا کہنا پڑے گا۔ کیونکہ ان کا مقابلہ کرنے والے ''علماء'' ہی ہوئے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بھی عرب کے کاہن اور علماء اُٹھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی اس زمانہ کے فقیہوں اور فریسیوں نے مقابلہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ایسے ہی لوگ آپ کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بھی انہی لوگوں نے مقابلہ کیا جو اپنے آپ کو ظاہری علوم کے لحاظ سے بہت بڑا عالم سمجھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مولوی محمد حسین بٹالوی نہایت حقارت سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ''منشی غلام احمد'' لکھا کرتے تھے۔ گویا آپ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ صرف منشی ہیں کہ دو چار سطریں لکھ لیتے ہیں، عالم نہیں ہیں اور وہ اس بات پر بہت خوش ہوتے کہ میں نے انہیں ''منشی'' لکھا ہے۔ مجھے یاد ہے میں اُس وقت چھوٹا بچہ تھا کہ مولوی سید محمد احسن صاحب امروہوی نے کسی مجلس میں بیان کیا کہ مولوی محمد حسین بٹالوی نے میری نسبت تو یہ لکھا ہے کہ یہ مولوی ہے مگر حضرت مسیح موعودؑ کے متعلق اس نے یہ لکھا ہے کہ وہ منشی ہیں۔ مجھے اس وقت بھی ان کی یہ بات بری معلوم ہوئی تھی اور آج بھی بُری محسوس ہوتی ہے۔ ان کے دل میں شاید مولویت کی کوئی قدر ہو تو ہو ہمیں تو کوئی مولوی کہہ دے تو چِڑ آجاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مولوی کا لفظ بُرا ہے۔ مولوی ایک عربی کا لفظ ہے اور یہ مولائی سے بنا ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارا مولا، ہمارا سردار اور ہمارا اُستاد مگر اب مولوی کے لفظ کا استعمال جن لوگوں پر شروع ہوگیا ہے اُن کو دیکھتے ہوئے اس بات سے شرم آتی ہے کہ

کوئی ہمیں مولوی کہہ دے۔ تو ظاہری علوم بالکل اور چیز ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ظاہری علوم والے روحانیت میں بھی کوئی درجہ رکھتے ہوں۔ قرآن کریم نے بے شک بعض لوگوں کو علماء قرار دیا ہے مگر اس نے ان ہی کو علماء قرار دیا ہے جو اپنے اندر خوفِ خدا رکھتے ہوں۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا [۴] کہ اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی خشیت رکھنے والے علماء ہیں اور جو اس کا خوف نہیں رکھتے وہ جاہل ہیں۔ گویا رسول کریم ﷺ کے زمانہ میں جس قدر علماء کہلانے والے تھے ان کو قرآن کریم نے جاہل قرار دیا اور جس قدر لوگوں کی نگاہ میں جاہل سمجھے جانے والے تھے اور رسول کریم ﷺ پر وہ ایمان لے آئے تھے انہیں عالم قرار دیا اور فرمایا عالم ابوبکرؓ ہے، عالم عمرؓ ہے، عالم عثمانؓ ہے، عالم علیؓ ہے، عالم طلحہؓ ہے، عالم زبیرؓ ہے اور عالم اور صحابہؓ ہیں مثلاً بلالؓ وغیرہ۔ مگر یہ جو عرب کے بڑے بڑے کاہن ہیں یہ سب جاہل ہیں عالم نہیں۔ تو ظاہری علوم کوئی چیز نہیں اصل چیز باطنی علوم ہیں اور جب وہ کسی کو حاصل ہو جائیں تو اُسی کی عزت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں قائم کی جاتی ہے اور انہی علوم کی کوئی قیمت ہوتی ہے۔

مولوی عبداللہ صاحب غزنوی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کے قریب زمانہ میں ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں ان کا ایک لطیفہ ہے جس سے اُن کی عزت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ امرتسر میں ایک دفعہ لوگوں نے مولوی عبداللہ صاحب غزنوی سے مقابلہ کرنے کیلئے ایک بڑا بھاری عالم تیار کیا جو علومِ مروّجہ میں خوب ماہر تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ مولوی عبداللہ صاحب کے پاس گئے اور انہیں کہا کہ آپ مجلس میں چلیے، آپ کی فلاں عالم سے بحث کرانی ہے۔ مولوی عبداللہ صاحب غزنوی بے شک عالم تھے مگر ایسے نہیں کہ انہوں نے صَرف ونحو کی گردانیں رٹی ہوئی ہوں۔ وہ ایک صوفی منش بزرگ تھے مگر لوگ چاہتے تھے کہ عربی کی ترکیبوں میں لاکر اُنہیں گرائیں اور ذلیل کریں۔ خیر وہ مجلس میں آ گئے۔ لوگوں نے کہا مولوی صاحب یہ فلاں عالم صاحب آئے ہیں کیا یہ آپ سے کوئی سوال کریں؟ مولوی عبداللہ صاحب غزنوی کی یہ عادت تھی اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بھی عادت تھی کہ جب خاموش ہوتے تو سر نیچے ڈال کر یا سر کو ہاتھ کا سہارا دے کر بیٹھے رہتے اور ذکرِ الٰہی کرنے والے بِالعموم ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ جب انہوں نے پوچھا کہ کیا یہ آپ سے کوئی سوال کریں؟ تو مولوی عبداللہ صاحب غزنوی نے فرمایا ''اگر نیت بخیر باشد'' یعنی اگر نیت نیک ہو تو بیشک وہ سوال

کریں۔ وہ آدمی بھی گو بظاہر دُنیوی علماء میں شامل تھا مگر اُس کے دل میں تقویٰ کی آگ جلتی تھی۔ جب انہوں نے کہا کہ اگر نیت بخیر باشد تو اُس نے سوال کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس وقت تو میں بحث کی نیت سے ہی آیا تھا۔ اور درحقیقت یہ جو اُس شخص میں تقویٰ پیدا ہوا مولوی عبداللہ صاحب غزنوی کی بات کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔

اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بھی ایک واقعہ ہے۔ شروع شروع میں مولوی محمد حسین صاحب جب مولوی ہو کر بٹالہ آئے تو ان کے خیالات بٹالہ کے رہنے والوں کو سخت گراں گزرے۔ آپؑ فرماتے کہ ایک دفعہ جب میں بٹالہ گیا تو چونکہ لوگوں کو میرے مذہبی جوش اور مذہبی تحقیق و تدقیق کا علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ عیسائیوں کے متعلق مَیں اکثر مضامین لکھتا رہتا ہوں اور صوفیاء کی میرے دل میں عزت ہے اس لئے بعض لوگ میرے پاس آئے اور کہنے لگے آپ سے ایک ضروری کام ہے، آپ ہمارے ساتھ فلاں مسجد میں چلیں۔ جب مَیں وہاں گیا تو مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی بیٹھے تھے اور لوگوں کا بہت بڑا مجمع تھا۔ لوگوں نے مجھے کہا کہ آپ حنفیوں کی طرف سے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی سے بحث کریں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم حنفیوں کی طرف ہیں کیونکہ حنفیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اول قرآن ہے اور پھر حدیث اور ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے۔ جب لوگوں نے آپ کو مولوی محمد حسین صاحب سے بحث کرنے کیلئے آمادہ کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا مجھے ان کے مذہب کا پتہ نہیں، پہلے یہ اپنا عقیدہ بیان کریں اس کے بعد میں ان پر کوئی اعتراض کر سکتا ہوں۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے بیان کیا کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ رسول کریم ﷺ کی طرف سے جو قول ثابت ہو جائے وہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے۔ اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا بھی یہی عقیدہ تھا اور ہمارا بھی یہی عقیدہ ہے۔ کیونکہ اگر رسول کریم ﷺ کی بات نہیں ماننی تو اور کس کی ماننی ہے؟ بہرحال جب آپ نے مولوی محمد حسین بٹالوی کی یہ بات سُنی تو فرمایا یہ بالکل ٹھیک ہے، مَیں اعتراض کس بات پر کروں۔ یہ سنتے ہی لوگ سخت غضب میں آ گئے اور انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ہار گئے، ہار گئے۔ بس یونہی عالم بنے پھرتے تھے، ہمیں اب پتہ لگا کہ یہ عالم نہیں جاہل ہیں۔ آپ نے لوگوں کی ان تمام باتوں کو سُنا مگر کوئی پرواہ نہ کی اور وہاں سے چلے آئے۔ واپسی کے وقت خدا تعالیٰ نے آپ پر الہام نازل کیا کہ چونکہ تُو نے میری خاطر یہ ذلّت برداشت کی ہے اس لئے ''تیرا خدا تیرے اس فعل سے راضی ہوا اور وہ تجھے

بہت برکت دے گا یہاں تک کہ بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے‘‘۔[۵]

تو علماءِ حقیقی وہی ہیں جن کا خدا تعالیٰ سے تعلق ہو مگر ان علماء میں سے بھی وہ لوگ جو اِس مقام پر نہیں پہنچے ہوئے ہوتے جس مقام پر پہنچ کر خدا تعالیٰ انہیں اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ[۶] کے خطاب سے مخاطب کرتا ہے، بعض دفعہ ٹھوکر کھا جاتے اور پھر ایسے ذلیل ہو جاتے ہیں کہ ان کی ذلّت کی کوئی انتہاء نہیں رہتی جیسے مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی تھے۔ شروع شروع میں انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتنی تعریف کی، اتنی تعریف کی کہ اسے دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے ایک پُر جوش مرید آپ کی تعریف کر رہا ہے۔ چنانچہ براہین احمدیہ پر انہوں نے جو ریویو کیا اس میں لکھا کہ رسول کریم ﷺ کے بعد تیرہ سَو سال کے عرصہ میں کسی ایک شخص نے بھی اپنے قول اور عمل سے اسلام کی اتنی خدمت نہیں کی جتنی حضرت مرزا صاحب نے کی ہے۔ مگر پھر وہی مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی تھے جنہوں نے آپ پر کُفر کا فتویٰ لگایا اور تمام ہندوستان میں آپ کی مخالفت کی آگ بھڑکائی۔ محض اس لئے کہ میری ہتک ہوئی ہے، مجھ سے اپنے دعویٰ کے متعلق حضرت مرزا صاحب نے مشورہ کیوں نہیں کیا۔ اور دراصل پہلا غصہ انہیں آپ پر یہی تھا۔ چنانچہ جب کسی شخص نے انہیں بتایا کہ آپ ایک ایسی کتاب لکھ رہے ہیں جس میں وفاتِ مسیح کا ذکر آتا ہے۔ تو مولوی محمد حسین بٹالوی کہنے لگے کہ ہم سے تو انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ پھر اسی غصہ میں وہ سارے ہندوستان میں پھرے اور آپ پر کُفر کا فتویٰ لگایا اور کہا کہ میں نے ہی اس شخص کو اونچا کیا تھا اور اب میں ہی اسے نیچے گراؤں گا۔[۷] مگر نتیجہ کیا نکلا ؟ انہوں نے اپنی تمام طاقتوں اور قوتوں کے ساتھ آپ کا مقابلہ کیا۔ تھوڑے دنوں کے لئے ہاؤ ہو کا شور بھی مچا لیا، آپ کو گالیاں بھی دی گئیں، آپ کو بُرا بھلا بھی کہا گیا۔ آپ کے خلاف لوگوں کو مشتعل بھی کیا گیا مگر آخر فتح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو ہی حاصل ہوئی۔

مجھے یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دفعہ ملتان کسی مقدمہ میں گواہی دینے کیلئے تشریف لے گئے۔ میں نے اُس وقت خواہش کی کہ میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ چنانچہ آپ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ میری عمر اُس وقت اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے ملتان میں کیا کیا دیکھا۔ جب ہم واپس آئے تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام لاہور میں بھی ایک دو دن ٹھہرے۔ اُنہی دنوں کسی دوست نے شہر کے اندر آپ کی دعوت کی۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ وہ کھانے کی دعوت تھی یا اُس

دوست نے کسی اور تقریب پر آپ کو بلایا تھا۔ جس وقت آپ وہاں سے واپس آرہے تھے تو وزیر خان کی مسجد یا سنہری مسجد کے قریب بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ مفتی محمد صادق صاحب بھی اُن دنوں وہیں قریب رہتے تھے اور میاں تاج دین صاحب وہیں رہتے تھے۔ میں نہیں جانتا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اُن میں سے کس دوست کے مکان پر تشریف لے گئے تھے۔ بہرحال جب واپس آئے تو مسجد کے قریب بہت بڑا ہجوم تھا اور جونہی لوگوں نے آپ کی گاڑی دیکھی انہوں نے تالیاں پیٹنی شروع کر دیں۔ بعض گالیاں دینے لگ گئے، بعض نے آپ کے خلاف نعرے لگائے اور شور سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ شاید یہ نظارہ میرے ذہن سے اُتر جاتا اور میں اِس واقعہ کو بالکل بُھول جاتا مگر بچپن کی عمر کے لحاظ سے ایک بات میں نے ایسی دیکھی کہ جس نے اس نظارہ کے نقوش کو بہت گہرے طور پر میرے دماغ پر ثبت کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڈھا شخص جس کی داڑھی ناف تک پہنچ رہی تھی، ۷۵۔۸۰ سال اس کی عمر ہوگی، اُس کا قد لمبا اور جسم دُبلا پتلا تھا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ پر زرد زرد پٹیاں باندھی ہوئی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا ہاتھ زخمی ہے اور ہاتھ پہنچے کے آگے سے کٹا ہؤا تھا۔ اپنے اس ٹنڈ کو دوسرے صحیح ہاتھ پر مار رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ ہائے ہائے مرزا، ہائے ہائے مرزا۔ اپنے بچپن کے لحاظ سے یہ نظارہ میرے لئے ایک عجیب نظارہ تھا کہ ایک شخص کا ہاتھ کٹا ہؤا ہے اور اُس پر ہلدی وغیرہ اس نے باندھی ہوئی ہے مگر وہ اپنا ٹُنڈ دوسرے ہاتھ پر مارتا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے ہائے ہائے مرزا، ہائے ہائے مرزا۔ بے شک یہ چیزیں ہوئیں اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اِن باتوں کو دیکھ کر خوش ہوئے اور وہ اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ دیکھا! ہم نے احمدیوں کا کیسا ناطقہ بند کیا، ان کو کیسا ذلیل اور کیسا رُسوا کیا۔ مگر دنیا کی نگاہوں میں جو ذلّت ہو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک عزت ہوتی ہے اور دنیا کی نگاہوں میں جو عزت ہو وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ذلّت ہوتی ہے۔ جس وقت وہ تمام لوگ ہنسی کر رہے تھے، جس وقت مولوی محمد حسین بٹالوی یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے ساری دنیا میں تبلیغِ احمدیت کے راستے بند کر دیئے ہیں۔ اُس وقت ہر گالی جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مل رہی تھی۔ وہ آپ کے انعامات اور خطابات اور القابات کی فہرست میں لکھی جا رہی تھی۔ آخر یہ ان گالیوں کا ہی نتیجہ ہے جو ہم یہاں بیٹھے ہیں اور کس بات کا نتیجہ ہے۔ پس وہ جتنا جتنا کہتے ہائے ہائے مرزا، ہائے ہائے مرزا یعنی نَعُوْذُ بِاللّٰہِ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مر گئے ہیں اور وہ آپ کا سیاپا کر رہے ہیں۔ اُتنا ہی فرشتے کہتے آپ

کواور زندگی ملے آپ کواور درجہ ملے اور آخر وہی بات پوری ہوئی جو خدا اور اُس کے فرشتوں نے کہی۔ وہ بات تو پوری نہ ہوئی جو مولوی محمد حسین بٹالوی نے کہی تھی۔

تو دنیا کی طرف سے جو عزتیں آتی ہیں وہ کوئی ہستی نہیں رکھتیں۔ ہاں جو عزت خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے وہی حقیقی عزت ہوتی ہے اور وہ اُنہی کو ملتی ہے جو خدا تعالیٰ کی خشیت اپنے دل میں رکھتے ہوں۔ ظاہری نام کے رٹ لینے سے وہ عزت نہیں مل سکتی۔ تو انسان کیلئے دنیا میں ہر مقام پر گرنے کا خطرہ ہے سوائے اس کے کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ جائے جہاں خدا خود اسے محفوظ قرار دے دے اور کہہ دے کہ اب تیرے گرنے کا کوئی خطرہ نہیں۔

غرض سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ تم اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کی دعا ہمیشہ پڑھتے رہو۔ یہ نہ ہو کہ ترقی کرتے کرتے تم کسی مقام پر پہنچ کر خوش ہو جاؤ اور سمجھ لو کہ اب ہم ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ ہمارا ایمان خراب نہیں ہوسکتا۔ فرمایا یہ ہمارا حق ہے کہ ہم کہیں جو چاہو کرو، تمہارا حق نہیں۔ کیونکہ خدا جب کسی بندے کو کہتا ہے کہ اب تُو جو جی میں آئے کر تو اس کے بعد اس کی نگرانی بھی کرتا ہے۔ لیکن بندہ جب اپنے متعلق خود بخود یہ مقام تجویز کر لیتا ہے تو چونکہ نگرانی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اس لئے وہ ٹھوکر کھاتا اور گر جاتا ہے۔ یہ وہ سورۃ ہے جو ہم پانچ وقت نمازوں میں روزانہ پڑھتے ہیں اور پھر پانچوں نمازوں کی ہر ایک رکعت میں پڑھتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ الٰہی! منعم علیہ گروہ میں شامل ہونے کے بعد ہم ارتداد کے گڑھے میں نہ گر جائیں۔ پھر وہ بات جس کا کسی نماز میں چار دفعہ، کسی نماز میں پانچ دفعہ، کسی نماز میں دس دفعہ اور کسی نماز میں گیارہ دفعہ ہم اقرار کرتے اور کہتے ہیں کہ منعم علیہ گروہ میں شامل ہونے کے بعد بھی انسان بعض دفعہ مغضوب اور ضالّ بن جاتا ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ یہ کیا ہوگیا، اس سے زیادہ بیوقوفی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی گورکن روزانہ قبریں کھودے اور لوگوں کو اپنے ہاتھ سے لحد میں اُتارے اور پھر لوگوں سے یہ کہے کہ کیا لوگ مر بھی جاتے ہیں؟ جب وہ روزانہ لوگوں کو دفن کرتا اور ان کی قبریں کھودتا ہے تو اُس کا موت پر تعجب کرنا بیوقوفی نہیں تو اَور کیا کہلائے گا۔ اسی طرح ایک انسان جب روزانہ پانچ دفعہ خدا تعالیٰ کے حضور جاتا اور کئی کئی رکعتوں میں تواتر اور تسلسل کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ یا اللہ! تُو مجھے بڑے بڑے انعامات دیجیو مگر ایسا نہ ہو

کہ انعامات حاصل کرنے کے بعد میں پھر گمراہ ہو جاؤں اور ارتداد کے گڑھے میں گر جاؤں۔ اس کا یہ کہنا کہ فلاں شخص ایمان لانے کے بعد مرتد کیوں ہو گیا، بیوقوفی اور حماقت ہے۔ اگر بڑے انعاموں کے حاصل کرنے کے بعد انسان مرتد نہیں ہوسکتا تو یہ دعا کیوں سکھائی گئی ہے جو تہجد اور اشراق اور ضحیٰ اور دوسرے نوافل کو اگر نکال بھی دیا جائے تو کم از کم پانچ وقت فرض نمازوں میں انسان مانگتا اور ہر رکعت میں مانگتا ہے۔ پھر فرائض کے علاوہ سنن اور نوافل ہیں جن میں یہی دعا مانگی جاتی ہے اور یہ نوافل عصر کے ساتھ بھی ہیں اور صبح کے ساتھ بھی ہیں اور دوسری نمازوں کے ساتھ بھی ہیں۔ ان سب میں انسان یہی دعا مانگتا ہے اور کم سے کم چار دفعہ ہر نماز میں خدا تعالیٰ سے کہتا ہے کہ یا اللہ! میں اعلیٰ سے اعلیٰ مومن بن جاؤں۔ مگر ایمان میں کمال حاصل کرنے کے بعد پھر منافق نہ بن جاؤں۔ ایمان میں کمال حاصل کرنے کے بعد پھر مرتد نہ ہو جاؤں۔ جب اتنی دفعہ ایک انسان یہ اقرار کرتا اور تسلیم کرتا ہے کہ منعم علیہ گروہ میں شامل ہو کر بھی انسان مغضوب اور ضال بن سکتا ہے تو اس کیلئے کسی انسان کا مرتد ہونا ہرگز کوئی عجیب بات نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ ابتلاء لوگوں کو شاذ و نادر کے طور پر آنا ہوتا تب بھی اتنی لمبی اور مسلسل دعا کی جو ہر نماز کی ہر رکعت میں مانگی جاتی ہے ضرورت نہیں تھی۔ مگر اس دعا کا مسلسل مانگا جانا بتاتا ہے کہ اس قسم کے ابتلاء ایسے شاذ نہیں ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب کسی قوم پر انعام نازل ہوتے ہیں تو وہی انعام اس قوم کو تباہ بھی کر دیا کرتے ہیں اگر اس قوم میں خشیة اللّٰہ نہ ہو۔ ہاں اگر خشیة اللّٰہ ہو تو وہ اس تباہی سے محفوظ رہتی ہے۔ اسی لئے ساری دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جسے ترقی اور عروج کے بعد زوال نہ ہؤا ہو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ انعام جہاں خوشی کا موجب ہوتے ہیں وہاں قوموں اور افراد کی تباہی کا موجب بھی ہو جاتے ہیں۔ جیسے اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ کے بعد غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ لا کر خدا نے بتا دیا کہ ہر انعام اپنے ساتھ ایک مخفی ابتلاء بھی رکھتا ہے اور مومنوں کو چاہئے کہ وہ ان ابتلاؤں سے محفوظ رہنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے رہیں۔ یہ ابتلاء عموماً دو وجہ سے آیا کرتے ہیں اور اگر مومن ان وجوہ کو یاد رکھیں تو ابتلاء آنے کا دروازہ بالکل بند ہو جائے۔ ایک وجہ ابتلاء آنے کی یہ ہوتی ہے کہ انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب میرے لئے انعام کے دروازے بند ہیں۔ جب کسی انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اب میرے لئے انعام کے حصول کے دروازے بند ہیں وہ تباہی کی طرف جانا شروع کر دیتا ہے۔

دراصل یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب بھی یہ خیال پیدا ہو جائے کہ انعام کے دروازے اب ہمارے لئے بند ہیں خواہ کسی قوم کے دل میں یا بعض افراد کے دل میں آئے وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر متبعینِ قرآن کو لے لو، قرآن ہمارے ہاتھ میں بھی وہی ہے جو غیر احمدیوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہی کے شائع کردہ قرآن ہم پڑھتے ہیں۔ لغتیں بھی انہی کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ مگر باوجود اس کے جب قرآن غیر احمدیوں کے ہاتھ میں جاتا ہے تو وہ بولتا ہی نہیں خاموش رہتا ہے۔ مگر جب ہمارے ہاتھ میں آتا ہے تو اتنا بولتا ہے، اتنا بولتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے اس کے معارف ختم ہونے میں ہی نہیں آتے اور واقع میں اس کے معارف ختم ہونے ہی نہیں آتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ بظاہر نہایت چھوٹی سی ہے اور وہ یہ کہ غیر احمدیوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر جو اِن کے بزرگ لکھ گئے اس کے بعد قرآن کریم کے معارف کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور کسی پر کوئی ایسا نکتہ نہیں کُھل سکا جو پہلے بزرگ نہ لکھ گئے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو انہیں وہی تفسیریں ملتی ہیں جو ان کے بزرگ لکھ گئے ہیں۔ کوئی نئی بات ان پر منکشف نہیں ہوتی۔ مگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہمیں آکر بتایا کہ قرآن مجید کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے معارف کا دروازہ بند ہو چکا ہے کُفر کا کلمہ ہے۔ اس میں سے نئے سے نئے معارف نکل سکتے ہیں اور نئی سے نئی تفسیریں اس کی آیات کی ہو سکتی ہیں۔ جب ہم اِس نکتہ اور اِس خیال کے ماتحت قرآن مجید کو پڑھتے اور اس پر غور اور تدبر کرتے ہیں تو ہمیں نئی سے نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ہم پر وہ معارف کُھلتے ہیں جو پہلے مفسرین نے اپنی کسی تفسیر میں نہیں لکھے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ ان مفسروں نے بڑی بڑی محنتیں کیں اور قرآن کریم کے اچھے اچھے معارف اور نکتے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ مگر ہم یہ ایک منٹ کیلئے بھی تسلیم نہیں کر سکتے کہ قرآن کریم کے معارف محدود ہوں اور جو پہلوں پر معرفت کی باتیں کُھل چُکیں اُن سے زائد کوئی باتیں قرآن کریم میں نہ ہوں۔ جب اس مادی دنیا کی ایجادات کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا تو ہم یہ کس طرح مان لیں کہ عَالَمِ روحانی کی ایجادات کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ پس چونکہ ہم اس نیت سے قرآن کریم کے پاس جاتے ہیں کہ وہ ایک زندہ کتاب ہے جو اپنی معرفت کے تازہ بتازہ پھل ہمیں کھلائے گی اس لئے خدا ہمارے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو ایک سخی میزبان اپنے مہمانوں کے ساتھ کرتا ہے۔ جس طرح حاتم طائی کے متعلق لکھا ہے کہ جب وہ مہمانوں کو دیکھتا تو اپنے اونٹ اور اپنی بکریاں ذبح

کر کر کے انہیں کھلاتا اور ان کی خاطر تواضع حد سے زیادہ کرتا۔ اسی طرح جب ہم قرآن کریم کے باغ میں داخل ہوتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے سخی کے پاس چلے گئے ہیں جسے اسی میں لذت آتی ہے کہ وہ تازہ بتازہ پھل ہمارے سامنے پیش کرے اور کھلائے۔ چنانچہ اس باغ کا مالک یعنی اللہ تعالیٰ اپنے معارف کے پھل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے میرا یہ پھل بھی کھاؤ، میرا وہ پھل بھی کھاؤ، میرے اس پھل کا بھی مزا چکھو اور میرے اس پھل سے بھی لطف اندوز ہو اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک باغ ہے جس میں کروڑوں قسم کے درخت لگے ہوئے ہیں اور ہر درخت پھلوں سے لدا ہوا ہے اور قسم قسم کے پھل بالکل پکے ہوئے تیار موجود ہیں اور باغ کا مالک ایک پھل اُتار کر کہتا ہے کہ اس باغ کا یہ پھل کھاؤ اور پھر دوسرا پھل پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بھی کھاؤ۔ اور پھر دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا اور چوتھے کے بعد پانچواں حتیٰ کہ وہ پھل توڑ توڑ کر ہمارے سامنے رکھتا چلا جاتا ہے اور کہتا ہے یہ بھی لو اور وہ بھی لو۔ اسے بھی چکھو اور اسے بھی چکھو۔ مگر جب اسی باغ میں غیر احمدی جاتے ہیں تو انہیں کیکر کے درختوں کے سِوا اور کوئی درخت نظر نہیں آتا اور کیکر کے درخت بھی ایسے جو خشک ہوں اور جن پر کوئی سبزی نہ ہو۔ نہ درختوں سے انہیں کچھ ملتا ہے اور نہ مالک انہیں پوچھتا ہے اور وہ خالی ہاتھ واپس آجاتے ہیں۔ اس کی وجہ محض ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ وہ اس باغ کے مالک کے پاس بدظنی اور بدگمانی سے بھرا ہوا دل لے کر جاتے ہیں۔ وہ پہلے ہی خیال کر لیتے ہیں کہ اس گھر کا مالک سخت بخیل اور کنجوس ہے، وہ ہمیں کچھ نہیں دے گا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انہیں کچھ نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے جب یہ مجھ پر بدظنی کرتے ہیں تو میں انہیں کیوں اپنی نعمتیں دوں۔ مگر جب ہم اس باغ کے مالک کے پاس جاتے ہیں تو اِس یقین کے ساتھ جاتے ہیں کہ یہ بہت ہی سخی ہے، اور ہمارے دامن کو اپنی نعماء سے پُر کر دے گا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ہمارے یقین سے بھی زیادہ مالا مال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مجھ پر حُسنِ ظن لے کر آئے ہیں۔ اب میں ان کے حُسنِ ظن سے بھی بڑھ کر ان سے سلوک کروں گا تا یہ میرے احسانات کے اور بھی گرویدہ ہوں۔ تو دیکھو کتنی چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں نے اس خزانہ کو کھو دیا۔ جب انہوں نے یہ سمجھا کہ اب قرآن کریم کے معارف کا انعام انہیں حاصل نہیں ہوسکتا، جو انعام ملنا تھا وہ ان کے بزرگوں کو مل چکا ان پر الٰہی معرفت کے دروازے بند ہوگئے۔ وہ قرآن کریم سے فائدہ اُٹھانے سے کُلّی طور پر محروم ہوگئے۔

اسی طرح کبھی ٹھوکر اس وجہ سے لگتی ہے کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ فلاں انعام کا مستحق میں تھا دوسرے کو کیوں مل گیا۔ جب انسان کے اندر اس قسم کا خیال پیدا ہوتا ہے تو وہ بھی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ حالانکہ اسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ میرے لئے خدا تعالیٰ نے کوئی اور انعام مقرر کیا ہوگا یا اس انعام کا نہ ملنا ہی میرے لئے مفید اور بابرکت تھا۔

مثنوی رومی میں ایک حکایت آتی ہے۔لکھا ہے ایک سپیرا تھا جسے ایک دفعہ کوئی نئی قسم کا سانپ ملا۔ وہ اسے پکڑ کر بہت ہی خوش ہوُا اور چونکہ سپیروں کی کمائی کا دارومدار سانپوں پر ہی ہوتا ہے اس لئے وہ خیال کرنے لگا کہ میں اب اس سانپ کے ذریعہ لوگوں سے بہت کچھ روپیہ کما سکوں گا۔ اتفاقاً رات کو جس گھڑے میں اُس نے سانپ رکھا تھا اُس پر ڈھکنا دینا وہ بھول گیا اور سانپ نکل گیا یا وہ سانپ زیادہ طاقتور تھا کہ ڈھکنے کے باوجود گھڑے میں سے نکل گیا۔ اتفاقاً اس کا ایک دوست اسے ملنے آیا اور اس نے خوشی سے ناچنا شروع کر دیا کہ مجھے ایک نئی قسم کا سانپ ملا ہے، آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔ جب وہ سانپ اسے دکھانے کیلئے گھڑے کی طرف گیا تو اس نے دیکھا کہ گھڑا خالی ہے اور سانپ اس میں موجود نہیں۔ یہ دیکھ کر اسے بہت ہی صدمہ ہوُا اور وہ ساری رات دعائیں مانگتا رہا کہ یا اللہ! میرا سانپ مجھے مل جائے۔تھوڑی دیر دعا کرنے کے بعد وہ اُٹھتا اور مکان کے کونوں میں تلاش کرتا اور دیکھتا کہ سانپ آیا ہے یا نہیں۔ جب اسے معلوم ہوتا کہ سانپ نہیں آیا تو پھر خدا کے حضور جُھک جاتا اور کہتا یا اللہ! میرا سانپ مجھے مل جائے۔تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اُٹھتا اور کونوں میں تلاش کرنا شروع کر دیتا اور جب نہ ملتا تو پھر دعائیں مانگنے لگ جاتا۔ آخر اسی طرح ساری رات اس نے دعا کرتے کرتے گزار دی۔ جب صبح ہوئی تو اس کے دل میں خیال آیا کہ میری تو ساری رات کی دعائیں ضائع گئیں اور میرا سانپ مجھے نہ ملا۔ اس کے دل میں ابھی یہ خیال گزر ہی رہا تھا کہ اُس کا ایک ہمسایہ اُسے بلانے آیا۔ جب وہ اس کے گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ تمام برادری اکٹھی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ کہنے لگے رات کو اس گھر والے کو ایک نئی قسم کا سانپ ملا تھا۔ اس نے اسے پکڑ لیا لیکن اس نے اسے کاٹ لیا اور چونکہ اس زہر کا تریاق ہماری قوم کے پاس موجود نہیں باوجود ہر قسم کے علاج کے وہ مر گیا۔ اس لئے ساری برادری کو بلایا گیا کہ اس سانپ کو دیکھ لیں تا آئندہ اس سے ہوشیار رہیں۔ اس شخص نے جب سانپ کو دیکھا تو وہ وہی سانپ تھا جس کے ملنے کے متعلق وہ ساری رات دعائیں مانگتا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ پھر سجدہ میں گر گیا اور کہنے لگا خدایا! یہ

میری بیوقوفی تھی جو میں نے کہا کہ تُو نے میری دعا نہیں سُنی ۔حقیقت یہ ہے کہ جب میں یہ کہہ رہا تھا کہ تو نے میری دعا نہیں سُنی ،اُس وقت تُو نے میری دعا سُن لی تھی ۔ کیونکہ اس کا نہ ملنا ہی میرے لئے مفید تھا اور اگر مل جاتا تو جو اس شخص کا انجام ہؤا وہ میرا ہوتا۔تو کبھی انعام کا نہ ملنا ہی انسانی بہتری کا موجب ہوتا ہے اور کبھی دُنیوی نعماء اور ترقیات ہی بے ایمانی کُفر اور ارتداد کا موجب ہو جاتی ہیں ۔تو یہ دو چیزیں ہیں جن سے ارتداد پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں ان دونوں باتوں کا ذکر کیا ہے اور ان وساوس کا جواب بھی دیا ہے ۔لیکن پیشتر اس کے کہ میں وہ جواب بتاؤں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ دعا مسلمانوں کو خاص طور پر سکھائی گئی ہے ۔کیا پہلی قوموں کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی دعا کی ضرورت نہیں تھی؟ کیا وجہ ہے کہ نوح کی قوم کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا نہیں سکھائی گئی اور کیا وجہ ہے کہ ابراہیم کے پیروؤں کو اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی دعا نہیں سکھائی گئی ۔کیا وہ صراطِ مستقیم کے محتاج نہیں تھے یا صراطِ مستقیم کا ملنا کوئی ایسی اہم بات تھی جس کا تکمیلِ دین سے تعلق تھا یا کیا دماغ ان کا اس قابل نہ تھا کہ صراط مستقیم کو سمجھتا؟ اللہ تعالیٰ تو خود فرماتا ہے هَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا[8] کہ ہم نے ان سب کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دی ۔پس جب انہیں صراطِ مستقیم کا ملنا قرآن کریم سے ثابت ہے تو معلوم ہؤا کہ وہ صراطِ مستقیم کے اہل تھے اور جب اس کے اہل تھے تو یہ دعا انہیں کیوں نہ سکھائی گئی ۔ پھر موسیٰ کے تابعین کو یہ دعا کیوں نہ سکھائی گئی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔اور پھر عیسیٰ کے حواریوں کو یہ دعا کیوں نہ سکھائی گئی ۔صرف محمد ﷺ کے متبعین کو یہ دعا کیوں سکھائی گئی اور انہیں کیوں کہا گیا کہ یہ دعا مانگو اور مانگو بھی اتنی کثرت سے کہ تمہاری پانچ نمازوں کی کوئی رکعت ایسی نہ ہو جس میں تمہارے منہ سے یہ دعا نہ نکلے ۔اس کی آخر کوئی حکمت ہونی چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کام حکمت سے خالی نہیں ہوتے ۔اس کی حکمت یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ ہی ایسے وجود تھے جن کے متعلق خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ وہ خاتم النّبیین ہیں یعنی ایسے کمالات ہم نے آپ کو بخش دیئے ہیں کہ اب کوئی شخص براہِ راست مقامِ نبوت تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ ہر شخص کو آپ کی غلامی اور اطاعت کرنی پڑے گی ۔اب ہر وہ شخص جس کے دل میں خدا تعالیٰ کے قُرب کی خواہش ہوا ُسے پہلی منزل پر ایک دھکا لگتا ہے اور اس کے دل کو ایک چوٹ لگتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ اچھا نبی آیا کہ جس نے آتے ہی ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کے

قرب کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ تو ایک ٹھوکر انسان کو اس طرح لگتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے اب میرے لئے الٰہی قُرب کے وہ دروازے بند ہو گئے جو پہلے کُھلے تھے اور واقعہ میں جب کہا جائے کہ محمد ﷺ کے بعد نبوت کا وہ دروازہ بند ہو گیا جو پہلے کُھلا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وہ دروازہ کُھلا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد وہ دروازہ کُھلا تھا اور ہر شخص براہِ راست اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کر سکتا تھا۔ مگر محمد ﷺ کے بعد یہ دروازہ بند ہو گیا۔ تو وہ انسان جو وصلِ الٰہی کا متمنی ہے اس پر ایک موت سی وارد ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ کیا ہؤا کہ آئندہ کیلئے اللہ تعالیٰ کے قرب کا وہ راستہ ہمارے لئے بند کر دیا گیا جو اس سے پہلے کُھلا تھا۔ تو چونکہ پہلی منزل پر ہی دل کو ایک صدمہ پہنچتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس صدمہ سے بچانے کیلئے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی دعا سکھائی اور بتایا کہ بیشک محمد ﷺ کے بعد کوئی مستقل نیا یا پرانا نبی نہیں آ سکتا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ترقیات کے دروازے بند ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کا قُرب کوئی انسان حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہماری یہ سنت ہے کہ جب ہم ایک دروازہ بند کرتے ہیں تو اُسی وقت دوسرا دروازہ کھول دیتے ہیں اور یہ وہی دروازہ ہے جس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی کتاب ''حقیقۃ الوحی'' میں لکھا کہ امتی نبی ہونے میں مَیں ہی منفرد ہوں۔ اور یہ ایک ایسا لذیذ مقام ہے کہ جس کی لذت کو میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ پھر آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ

ابنِ مریم کے ذکر کو چھوڑو
اس سے بہتر غلامِ احمد ہے[9]

اب یہ دروازہ بند تو نہ ہؤا ہاں ایک قسم کا دروازہ ضرور بند کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر کسی گھر کے دو دروازے ہوں اور ایک کو بند کر دیا جائے تو گھر میں داخل ہونا تو پھر بھی جاری رہا۔

پس اصل غرض تو انسان کی دنیا میں آنے سے یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے اور وہ اس کی محبت کے حصول میں کسی سے پیچھے نہ رہ جائے اور یہ وہ دروازہ ہے جو خدا تعالیٰ نے بند نہیں کیا بلکہ اسی طرح کھلا ہے جس طرح پہلے کھلا تھا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی دعا سکھا کر مومنوں کے دلوں کو ڈھارس دی اور انہیں بتایا کہ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی دروازہ مومنوں کیلئے بند کیا جائے تو اسے بند نہ سمجھو۔ کیونکہ یہ اس کی سنت ہے کہ وہ ایک دروازہ

بند کرتا ہے تو دوسرا دروازہ فوراً کھول دیتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ نے اس نبوت کا دروازہ بند کیا جو پہلے جاری تھی تو ایک اور نبوت دنیا میں جاری کر دی جسے اُمتی نبوت کہتے ہیں۔ اور اس میں وہ مقامِ قُرب رکھا کہ باوجودیکہ اُمتی نبی مستقل نبی نہیں ہوتا یعنی ایسا نبی جس نے براہِ راست اللہ تعالیٰ سے نبوت حاصل کی ہو یا کوئی نئی شریعت لایا ہو، پھر بھی اللہ تعالیٰ کے حضور وہ اتنا بلند درجہ رکھ سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ سکتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت نوحؑ سے بھی بڑھ سکتا ہے۔ تو قُرب کا مقام ویسا ہی کُھلا رہا جیسے پہلے کُھلا تھا۔ بلکہ خدا نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نمونہ پیش کر کے بتا دیا کہ ہم رسول کریم ﷺ کی پیروی میں تمہیں پہلے تمام نبیوں کے کمالات دے سکتے ہیں۔ جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ

آنچہ داد است ہر نبی را جام
داد آں جام را مرا بتمام[10]

کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے وہ جام جو پہلے انبیاء کو فرداً فرداً ملے تھے وہ تمام جام اللہ تعالیٰ نے اکٹھے کر کے مجھے پلا دیئے ہیں۔ اسی بنا پر آپ نے دعویٰ کیا کہ میں آدم ہوں، میں شیث ہوں، میں نوح ہوں، میں ابراہیم ہوں، میں اسحٰق ہوں، میں اسمٰعیل ہوں، میں یعقوب ہوں، میں یوسف ہوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں، میں عیسیٰ ہوں اور آنحضرت ﷺ کے نام کا مَیں مظہرِ اتم ہوں یعنی ظِلّی طور پر محمد اور احمد ہوں۔ گویا رسول کریم ﷺ کے خَاتم النّبیّن ہونے سے قرب اور وصالِ الٰہی کا دروازہ بند نہیں ہؤا بلکہ ایک خاص قسم کی نبوت جس کی دنیا کو ضرورت نہیں تھی تکمیلِ شریعت کی وجہ سے بند کی گئی اور نبوت کی وہ دوسری قسم جو پہلی قسم سے کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہے کیونکہ اس میں اسی اُستاد کی شاگردی کا مقام حاصل ہوتا ہے جو سب نبیوں کی خوبیوں کا جامع ہے، جاری کی گئی۔ تو بہت سے ابتلا لوگوں کو اس لئے آتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں اب ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کے قُرب کا دروازہ بند ہو گیا حالانکہ خدا اپنے قُرب کے دروازوں کو کبھی بند نہیں کیا کرتا۔

ہمارے زمانہ میں جو کئی لوگوں کو ابتلا آتا ہے یا بعض دفعہ بڑے بڑے لوگ یا اپنے آپ کو بڑا سمجھنے والے لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہیں تو وہ بھی اسی وجہ سے ٹھوکر کھاتے ہیں کہ وہ خیال کر لیتے ہیں کہ فلاں نعمت کا دروازہ ہمارے لئے بند ہو گیا۔ مثلاً خلافت ہے، وہ خیال کرتے ہیں کہ اگر پارلیمنٹ ہوتی تو

پندرہ بیس آدمی اس میں شریک ہوتے مگر اب ایک شخص خلیفہ ہو گیا ہے اور یہ اعزاز اُسی کو حاصل ہے دوسرا کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خلافت ایک ایسا عُہدہ ہے جو لازماً ایک شخص کو ہی ملے گا، زیادہ کو نہیں مل سکتا۔ پس وہ سمجھتے ہیں کہ اب اس عُہدہ پر تو ایک شخص قابض ہو گیا، ہم کیا کریں۔ اگر یہ خلیفہ بننے کا اہل تھا تو ہم بھی خلیفہ بننے کے اہل ہیں۔ نہ یہ اُترتا ہے کہ کوئی اور خلیفہ بنے اور نہ مرتا ہے کہ کسی اور کو خلافت کا مقام حاصل ہو۔ گویا ان کے نزدیک خلافت کے مقام کی حیثیت ویسی ہی ہونی چاہئے جیسے لڑکے جب آپس میں کھیلتے ہیں اور ایک دوسرے پر سوار ہوتا ہے تو نچلا لڑکا کہتا ہے ''اتر کانٹو میں چڑھاں'' اس پر اوپر والا لڑکا اُتر کر نیچے ہو جاتا ہے اور نیچے والا اوپر سوار ہو جاتا ہے۔ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ خلافت کا مزا تب تھا کبھی میں خلیفہ بنتا کبھی وہ، کبھی زید بنتا کبھی بکر۔ مگر چونکہ ان کی یہ آرزوئیں پوری نہیں ہوئیں اس لئے اندر ہی اندر ایک جلن اور سوزش اور حسد کی آگ انہیں جلائے رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں اتنی مدت گزر گئی، اب تک یہی خلیفہ بنا بیٹھا ہے (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) مرتا بھی نہیں کہ ہمیں یہ عزت حاصل ہو۔ پھر ان کا نفس اندر ہی اندر تدبیریں سوچتا ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ جب یہ مرتا نہیں تو اسے خلافت سے اُتارنے کی کوشش کریں۔ شاید اسی طرح ہم کو خلیفہ بننے کا موقع مل جائے۔ یہ ایسے ہی وسوسے ہوتے ہیں جیسے عارضی طور پر رسول کریم ﷺ کے مقام کے ذریعہ لوگوں کو ایک دھکا لگتا ہے اور نادان انسانوں کے دلوں میں اس قسم کے خیالات اُٹھنے شروع ہو جاتے ہیں کہ اس رسول نے ہمارے لئے ترقیات کے دروازے بند کر دیئے اور جو انعامات پہلے براہِ راست مل جایا کرتے تھے وہ اب براہِ راست نہیں مل سکتے۔

تو اللہ تعالیٰ نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں انہی وساوس اور شبہات کا ازالہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ تم کو اگر میرے قُرب اور وصال کی ضرورت ہے تو یاد رکھو میرے قُرب اور وصال کے تمام دروازے کُھلے ہیں اور ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں ہوا۔ اور اگر تمہیں اپنی عزت کی خواہش ہے تو پھر جاؤ اور اپنی عزت کو آپ تلاش کرتے پھرو۔ غرض لوگوں کے ان تمام وساوس کا اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں جواب ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بتا دیا ہے کہ اگر تمہیں میرے انعامات کی خواہش ہو تو تم تقویٰ اللہ اختیار کرو ہم ہر روحانی کمال تمہیں دینے کیلئے تیار ہیں اور تمہارے لئے میرے قُرب اور وصال کے دروازے اسی طرح کُھلے ہیں جس طرح دوسروں کے لئے۔ لیکن اگر تم اپنے نفس کی عزت چاہتے ہو اور دُنیوی وجاہت کے

شائق ہوتو پھر مجلسیں بناؤ اور ان کے صدر بن جاؤ۔ ہماری طرف سے تو جو عزت ملے گی وہ اسی طرح ملے گی کہ تم اپنے آپ کو کلیۃً ہمارے آستانہ پر ڈال دو۔ اور اس امر کو جانے دو کہ تمہیں کیا انعام ملے۔ تم ہمارے قُرب اور ہمارے وصال کے طلبگار بن کر ہمارے پاس آؤ۔ پھر تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ بھی ہمارا بالکل ویسا ہی سلوک ہوتا ہے جیسے دوسروں کے ساتھ۔

پس اللہ تعالیٰ کی محبت کے راستہ میں نہ کوئی نبی روک بن سکتا ہے نہ کوئی خلیفہ۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص کی بعض نمازیں خدا تعالیٰ اس لئے قبول نہ کرے کہ اگر میں نے اس شخص کی یہ نمازیں قبول کیں تو یہ روحانیت میں خلیفہ سے ترقی کر جائے گا۔ تم جتنی عبادتیں چاہو کرو، تم جس قدر اللہ تعالیٰ کی محبت کو اپنی طرف کھینچ سکتے ہو کھینچو خدا کے قُرب کے دروازے تمہارے لئے کُھلے ہیں اور اس میں کوئی خلیفہ روک نہیں بن سکتا۔ غرض جو حقیقی عزت ہے اس کی راہ میں نہ خلیفہ روک ہے اور نہ نبی۔ بلکہ انبیاء اور خلفاء اللہ تعالیٰ کے قُرب کے حصول میں لوگوں کے مُمد ہوتے ہیں۔ جیسے کمزور آدمی پہاڑ کی چڑھائی پر نہیں چڑھ سکتا تو سونٹے یا کھڈ سٹک کا سہارا لے کر چڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح انبیاء اور خلفاء لوگوں کیلئے سہارے ہیں۔ وہ دیواریں نہیں جنہوں نے الٰہی قُرب کے راستوں کو روک رکھا ہو بلکہ وہ سونٹے اور سہارے ہیں جن کی مدد سے کمزور آدمی بھی اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کر لیتا ہے۔ پس اگر کسی شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء اور خلفاء کے وجود سے قُربِ الٰہی کی روکیں پیدا ہوگئی ہیں تو وہ بیوقوفی کا خیال ہے۔ حقیقی کمالات کے حصول کی راہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضلوں کا مورد بننے کے طریق ہمیشہ کُھلے رہتے ہیں اور انبیاء وخلفاء اس میں روک بننے کی بجائے لوگوں کیلئے مُمد ہوتے ہیں۔

پھر دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو بڑی بڑی امنگیں تو نہیں رکھتے مگر انہیں اس بات پر ٹھوکر لگ جاتی ہے کہ فلاں درجہ فلاں کو کیوں مل گیا، ہمیں کیوں نہیں ملا۔ ان کیلئے بھی اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ میں جواب ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کے انعامات ایک قسم کے نہیں بلکہ مختلف قسم کے ہیں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوح کے ساتھ یہ معاملہ ہوا کہ اُس نے ان کے تمام دشمنوں کو غرق کر دیا۔ لیکن ابراہیمؑ کے ساتھ اس نے یہ سلوک نہیں کیا کہ ان کے دشمنوں کو اس نے اس طرح غرق کیا ہو۔ بلکہ ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم ہجرت کر کے چلے جاؤ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل وطن اُور تھا جو عراق کا علاقہ ہے۔ وہاں لوگوں نے

آپ کی شدید مخالفت کی اور آگ میں ڈال کر آپ کو جلانا چاہا تب اللہ تعالیٰ نے نوح کی طرح یہ نہیں کہا کہ ابراہیم میں تیرے تمام مخالفوں کو برباد کردوں گا بلکہ یہ کہا اے ابراہیمؑ! یہ گندہ علاقہ ہے اس علاقے کو چھوڑ دے۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو عراق سے فلسطین میں لایا جو بہت بڑے فاصلہ پر واقع تھا۔ آجکل ریل کی وجہ سے لوگ اس امر کو نہیں سمجھ سکتے کہ فاصلہ کس قدر زیادہ ہے۔ مگر پُرانے زمانہ میں جبکہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ میل کے بعد یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دنیا ختم ہوگئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عراق سے فلسطین ہجرت کر کے آنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ عراق سے چلے گئے اور راستہ کے تمام بیابان طے کرتے ہوئے کنعان میں پہنچے۔ جہاں خدا تعالیٰ نے آپ کو عزت بخشی۔ یہ انعام ان کو بیشک ملا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بادشاہت نہیں ملی۔ آپ تجارت کرتے تھے اور کچھ جانور رکھے ہوئے تھے جن پر آپ کا گزارہ تھا۔ کنعان آ کر کچھ زمینیں آپ کو تحفہ کے طور پر آپ کے مریدوں کی طرف سے مل گئیں۔ جہاں آپ گلے چراتے اور تجارت کرتے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تو ان سے معاملہ خدا تعالیٰ نے بالکل اَور رنگ میں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہجرت بھی کرائی اور انہیں لاکھوں کی قوم دے کر اس کا انہیں بادشاہ بھی بنا دیا لیکن ملک آپ کو عطا نہیں کیا۔ آپ جسموں پر بیشک حکومت کرتے تھے مگر کسی ملک پر آپ نے حکومت نہیں کی۔ گویا سیاسی بادشاہت آپ کو حاصل تھی مگر مُلکی نہیں۔ اور پیشتر اس کے کہ آپ کنعان کی سرزمین تک پہنچتے یہود کو ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے چالیس سال تک جنگلوں میں پھرنے کی سزا دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی عرصہ میں وفات پاگئے۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مُلکوں پر حکومت نہیں ملی، ہاں انسانوں پر حکومت آپ کو بے شک مل گئی۔ پھر حضرت داؤد علیہ السلام آئے تو انہیں اللہ تعالیٰ نے ملکوں پر بھی حکومت عطا کی اور جسموں پر بھی حکومت عطا کی۔ حالانکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع نبی تھے۔ لیکن باوجود تابع نبی ہونے کے بادشاہت اور نبوت دونوں ان میں جمع تھیں۔ اور بادشاہت بھی دونوں قسم کی یعنی ملکی بادشاہت بھی اور سیاسی بادشاہت بھی۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تو باوجود اس کے کہ جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے اور جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے، آپ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے درجہ میں بڑھ کر تھے، پھر بھی آپ ایسی غربت اور کمزوری کی حالت میں آئے کہ آپ کہتے ہیں درندوں کیلئے ماندیں ہیں اور پرندوں کیلئے گھونسلے مگر ابن آدم کیلئے سر چھپانے کی بھی جگہ نہیں۔[۱۱] گویا وہ اپنی بے بسی

اور بیکسی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ جنگل کے درندے تمام دن اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد آرام کرنے کیلئے غاروں میں چلے جاتے ہیں۔ پرندے فضائے آسمانی میں اڑتے ہیں تو کچھ وقت کے بعد اپنے گھونسلوں میں آرام کرنے کیلئے چلے جاتے ہیں۔ مگر میرے لئے اس دنیا میں کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں۔ اب یہ الگ الگ قسم کی نعمتیں ہیں جو انبیاء کو ملیں اور الگ الگ سلوک ہیں جو خدا تعالیٰ نے ان سے کئے۔ کیا ان مثالوں کو دیکھ کر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خدا تعالیٰ نے نعمت نازل نہیں کی۔ مگر حضرت داؤد علیہ السلام پر کی کہ انہیں نبی بھی بنا دیا اور بادشاہ بھی۔ پھر رسول کریم ﷺ کو دیکھو۔ آپ چونکہ تمام انبیاء کے کمالات کے جامع تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ سے نوح والا معاملہ بھی کیا اور ابراہیمؑ والا معاملہ بھی کیا۔ موسیٰؑ والا معاملہ بھی کیا اور داؤدؑ اور عیسیٰؑ والا معاملہ بھی کیا۔ غرض سارے معاملے آپ سے ہوئے۔ نوح کا معاملہ آپ سے اس طرح ہؤا کہ یہود کے بعض قبائل آپ کے زمانہ میں بالکل تہہِ تیغ کر دیئے گئے اور جس طرح نوحؑ کے دشمنوں میں سے ایک شخص بھی نہیں بچا تھا اسی طرح ان قبائل میں سے ایک شخص بھی نہ بچ سکا اور سب تہہِ تیغ ہو گئے اور تہہِ تیغ بھی اپنے فتویٰ کے مطابق ہوئے۔ کیونکہ انہوں نے جس شخص کو فیصلہ کرنے کیلئے مقرر کیا تھا اُس نے یہی فیصلہ دیا کہ جس قدر مرد ہیں وہ تہہِ تیغ کر دیئے جائیں۔ لوگ اس پر اعتراض کرتے اور کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ) ظلم کیا۔ حالانکہ وہ نادان یہ نہیں جانتے کہ محمد ﷺ تمام نبیوں کے کمالات کے جامع تھے اور کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس کے آپ مظہر نہ ہوں۔ پس چونکہ آپ حضرت نوح علیہ السلام کے بھی مظہر تھے اس لئے ضروری تھا کہ جس طرح نوح کے دشمن سب کے سب ہلاک کئے گئے اسی طرح آپ کے بعض دشمن بھی تمام کے تمام ہلاک کئے جاتے۔ پھر حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی طرح آپ کو ہجرت بھی کرنی پڑی اور اس ہجرت کے زمانہ میں کچھ وقت آپ پر ایسا آیا جب آپ سیاسی طور پر حکمران تو تھے مگر مُلکی طور پر نہیں۔ پھر کچھ وقت حضرت داؤد کی طرح آپ پر ایسا بھی آیا جب آپ سیاسی اور ملکی دونوں طرح بادشاہ تھے۔ پھر آپ کو حضرت عیسیٰ والی غربت بھی دیکھنی پڑی اور آپ نے مکہ میں بڑی بڑی تکالیف اُٹھائیں۔ یہاں تک کہ جب مکہ فتح ہؤا اور آپ ایک فاتح اور بادشاہ کی حیثیت میں اس میں داخل ہوئے تو ایک صحابی نے عرض کیا کہ آپ کی رہائش کا انتظام کس گھر میں کیا جائے؟ تب بعینہٖ وہی فقرہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلا تھا رسول کریم ﷺ کی زبان سے بھی نکلا اور

آپ نے فرمایا میرے رہنے کا کیا پوچھتے ہو، عقیل نے تو میرے لئے مکہ میں کوئی گھر نہیں چھوڑا جس میں میں رہ سکوں۔ دراصل رسول کریم ﷺ جب مدینہ تشریف لے گئے تھے تو آپ کے رشتہ داروں نے مخالفت کی وجہ سے آپ کے اکثر مکانات بیچ ڈالے تھے اور بعض پر خود قبضہ کرلیا تھا۔ جس طرح انسان جب مرجاتا ہے تو اُس کے ورثاء اس کی جائداد پر قبضہ کرلیتے ہیں اسی طرح انہوں نے آپ کی جائداد سے معاملہ کیا اور جب آپ مکہ میں فاتحانہ حیثیت میں داخل ہوئے تو کوئی ایسا مکان نہ تھا جسے آپ اپنا مکان کہہ سکیں۔ اب یہ کتنا دردناک نظارہ ہے کہ ایک بادشاہ ہونے کی حیثیت میں رسول کریم ﷺ اپنے مُلک اور اپنے شہر میں داخل ہوتے ہیں مگر کوئی گھر ایسا نہیں ملتا جسے آپ اپنا گھر کہہ سکیں۔ آپ فرماتے ہیں مکہ میں تو ہمارے لئے کوئی گھر نہیں رہنے دیا گیا۔ میدان میں خیمے لگاؤ اور وہاں میری رہائش کا انتظام کرو۔ غرض یہ ساری چیزیں رسول کریم ﷺ کی ذات میں جمع تھیں اور پھر ساری عزتیں بھی آپ کی ذات میں جمع ہوئیں۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن ہمیشہ کیلئے مغضوب ہوگئے تھے، اِسی طرح رسول کریم ﷺ کے بعض دشمنوں کو بھی خدا نے مغضوب قرار دیا۔ جس طرح نوح کے دشمنوں کو خدا تعالیٰ نے کُلّی طور پر ہلاک کردیا تھا اسی طرح آپ کے بعض دشمنوں کو بھی اس نے کُلّی طور پر ہلاک کیا۔ جس طرح موسیٰ کے دشمنوں کو اُس نے پانی میں غرق کیا اسی طرح رسول کریم ﷺ کے دشمنوں کو بھی اس نے غرق کیا۔ دونوں طرح یعنی خشکی میں بھی اور تری میں بھی۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد مکہ کے بعض بڑے بڑے سردار مکہ سے بھاگ نکلے اور وہ جہازوں میں سوار ہوکر کسی اور ملک کو جانے لگے تو سمندر میں ایسا طوفان آیا کہ وہ جہاز غرق ہوگیا اور سب پانی میں ڈوب گئے۔ غرض وہ تمام انعامات جو پہلے انبیاء کو ملے وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع تھے۔ پھر موجودہ زمانہ میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے تو آپ کے ساتھ پھر وہی سلوک ہوا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوُا تھا۔ حکومت غیر ہے، دشمن زور میں ہے، جماعت کمزور ہے، لوگ گالیاں دیتے ہیں، ہنسی کرتے ہیں، مذاق اُڑاتے ہیں، اشتعال دلاتے ہیں مگر جماعت کو یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ صبر کرو، صبر کرو اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہے۔ پھر جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عدالتوں میں کھڑا کیا گیا اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی عدالتوں میں جانا پڑا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک ظالم مجسٹریٹ نے جب کہ آپ کا بڑھاپا تھا اور آپ کو اسہال کی تکلیف تھی اور سخت پیاس لگی ہوئی تھی آپ کو

اس بات کی بھی اجازت نہ دی کہ آپ پانی پی سکیں۔ اب کیا کوئی اس حالت کو دیکھ کر کہ اِدھر تو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ کہتے ہیں کہ مجھے سارے انبیاء کی خلعت ملی اور ادھر یہ حالت ہے کہ آپ بڑھاپے اور کمزوری اور اسہال کی حالت میں جب کہ آپ کو سخت پیاس لگتی ہے، مجسٹریٹ سے پانی پینے کی اجازت مانگتے ہیں اور وہ پانی پینے کی اجازت نہیں دیتا، کہہ سکتا ہے کہ آپ انعامات سے محروم رہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہتا ہے تو وہ نہایت ہی احمق ہے کیونکہ انعامات مختلف اقسام اور مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جس رنگ میں ایک پر انعام ہؤا اسی رنگ کا انعام دوسرے پر بھی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں مسلمانوں کو یہ بتایا ہے کہ بعض دفعہ ایک قسم کا انعام اگر تمہیں نہ ملے اور دوسروں کو مل جائے تو تم حرص اور لالچ نہ کیا کرو۔ تمہیں کیا معلوم ہے کہ تمہارے لئے جو انعام مقدر ہے وہ کیسا ہے اور کس صورت میں ہے۔ اگر ظاہری انعاموں کو ہی انعام کہا جائے تو پھر ماننا پڑے گا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام بھی ان انعامات سے محروم رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان انعامات سے محروم رہے۔ اور پھر تم کو ماننا پڑے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان انعاموں سے محروم رہے اور اسی طرح اور بہت سے انبیاء مثلاً حضرت یحییٰ اور زکریا وغیرہ بھی انعامات سے محروم رہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں انہی کا ذکر فرماتا ہے کہ تم یہ دعا مانگو کہ الٰہی! ہمیں اس راستہ پر چلا جس راستہ پر چل کر تیرے پیارے بندوں نے انعامات حاصل کئے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے کسی خاص شخص کا ذکر نہیں کیا بلکہ تمام منعم علیہ گروہ کا ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم یہ مانگو کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ مُوْسٰی۔ کیونکہ تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے لئے موسوی انعام بہتر ہے یا عیسوی انعام بہتر ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بھی نہیں کہا کہ تم یہ مانگو کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ عِیْسٰی کیونکہ ممکن ہے عیسوی انعام کے تم اہل نہ ہو تم ابراہیمی انعام کے مستحق ہو۔ اور پھر یہ بھی نہیں کہا کہ تم کہو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ اِبْرَاھِیْمَ کیونکہ تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے لئے ابراہیم والا انعام موزوں ہے، ممکن ہے تمہارے لئے نوح کا انعام مقدر ہو۔ غرض اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کا اس میں ذکر نہیں کیا بلکہ اس دعا میں عام رنگ رکھا اور فرمایا کہ تم یہ دعا مانگو کہ الٰہی! ہمیں اس راستہ پر چلا جس راستہ پر چل کر موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور داؤدؑ اور سلیمانؑ اور نوحؑ اور تیرے ہزاروں کامل اور اکمل بندوں نے جو صدیق، شہید اور صلحاء تھے انعام

حاصل کیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں سے جس نبی یا جس کامل بندے کا انعام تمہارے مناسب حال ہوگا وہ انعام اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرما دے گا اور اگر وہ یہ دیکھے گا کہ تم تمام نبیوں کے انعامات کے مستحق ہو تو تمہیں تمام نبیوں کے انعامات سے حصہ دے دے گا۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے متعلق فرمایا کہ ؎

آنچہ داد است ہر نبی را جام
داد آں جام را مرا بتمام

کہ وہ جام جو اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں کو پلایا تھا وہ اس نے بھر کر مجھے بھی پلا دیا۔ تو ممکن ہے خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے یہ مقدر کیا ہؤا ہو کہ تم سارے نبیوں کے کمالات حاصل کرو۔ پھر تم اس سے کسی ایک نبی کا کمال کیوں مانگتے ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کے کمالات تمہارے کمالات سے مطابقت نہ رکھتے ہوں، اس صورت میں تمہارا ان نبیوں کے کمالات طلب کرنا بھی غلطی ہے۔ تم خدا تعالیٰ سے صرف یہ مانگو کہ وہ تمہیں اپنے قُرب میں بڑھائے اور پہلے کامل بندوں میں سے جس کامل بندے کے ساتھ بھی تمہاری روحانی مناسبت ہے اس کے انعامات سے تمہیں بہرہ ور فرمائے۔ اگر خدا دیکھے گا کہ تم ابراہیمی جام کے مستحق ہو تو وہ تمہیں ابراہیمی جام پلا دے گا اور اگر دیکھے گا کہ موسوی جام کے مستحق ہو تو موسوی جام پلا دے گا۔ لیکن اگر تم داؤدی جام کے مستحق ہو اور تم اس سے ابراہیمی جام مانگتے رہو یا سلیمانی جام کے مستحق ہو اور تم اس سے عیسوی جام مانگتے رہو تو گو اللہ تعالیٰ تمہارا انعام تمہیں دے دے گا مگر وہ انعام ناقص ہوگا۔ کیونکہ تمہاری دعا کسی اور طرف جارہی ہوگی اور خدا تعالیٰ کا ارادہ کسی اور طرف ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص خود کسی امر کی تعیین نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ سے صرف یہ کہتا ہے کہ تُو میرے اندر جن کمالات کو دیکھ رہا ہے ان کے مناسبِ حال جو انعام مجھے ملنا چاہئے وہ دے تو اس کے نتیجہ میں اسے جو جام بھی ملے گا وہ کامل ہوگا۔ کیونکہ ایک طرف اس کی دعا اس انعام کو طلب کر رہی ہوگی تو دوسری طرف خدا تعالیٰ کا ارادہ اس انعام کو قریب لا رہا ہوگا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے مومن کو یہ سکھایا ہے کہ تم یہ دعا مانگا کرو کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی تم جمع کے صیغے میں دعا مانگا کرو اور یہ کہا کرو کہ خدایا! جو بھی اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں سے ہمارے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور جس کی روحانی قابلیتیں ہماری قابلیتوں سے توارد رکھتی ہیں، اس کا جام ہمیں پلا دے۔ وہ اگر موسوی جام ہے تو موسوی جام

پلا دے۔ داؤدی صفات ہمارے اندر پائی جاتی ہیں تو داؤدی جام پلا دے۔ سلیمانی صفات پائی جاتی ہیں تو سلیمان کا جام پلا دے اور اگر عیسیٰ کی پھانسی ہمارے لئے مقدر ہے تو وہی پھانسی ہمیں دلا دے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی کی سزا کا ملنا گو دُنیوی نقطہ نگاہ میں معیوب امر تھا مگر اس میں کیا شبہ ہے کہ خدا سے تعلق رکھنے والوں کیلئے اسی پھانسی میں عزت ہے اور ان کی نگاہ میں یہ سزا نہیں بلکہ عزت ہے۔ یا ممکن ہے خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے ابراہیمی ہجرت مقدر کی ہو اور تم اس سے سلیمانی انعام مانگتے رہو یا وہ تمہیں سلیمانی جام پلانا چاہتا ہو اور تم ابراہیمی ہجرت کے طلبگار رہو۔

غرض اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ تم کسی کو انعام ملنے پر حسد اور لالچ مت کیا کرو۔ کیونکہ ممکن ہے تم اس انعام کے اہل ہی نہ ہو۔ یا ممکن ہے تمہارے لئے کوئی اور انعام مقدر ہو اور تمہارا رونا پیٹنا محض بے ایمانی اور نفاق کی علامت ہو۔ اگر کوئی انسان اس نکتہ کو نہیں سمجھتا اور وہ خدا تعالیٰ سے معیّن طور پر کوئی ایسا انعام مانگتا ہے جس کا وہ اہل نہیں تو اگر وہ کمزور ایمان والا ہوگا تو فرشتے اس کا کان پکڑ کر الٰہی دربار سے نکال دیں گے۔ اور کہیں گے گستاخ تُو خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں شوخی سے کام لیتا ہے۔ اور اگر وہ ایسا کامل انسان ہے کہ ارتداد اس کیلئے مقدر نہیں تو کم از کم اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا انعام بہت کم ہو جائے گا۔ پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں خدا تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسی جامع دعا سکھائی ہے کہ جس کے مطلب کو سمجھ کر انسان کُفر اور نِفاق سے بچ سکتا ہے اور بنی نوع انسان کو یہ ہدایت کی ہے کہ تم کبھی یہ خیال نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ یا فلاں کو جو مقام حاصل ہوا تو اس کا اہل وہ نہ تھا تم تھے۔ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے اور اگر یہ نظر آتا ہو کہ بظاہر ایک دروازہ بند ہو گیا تو خدا تعالیٰ معاً اس کے ساتھ ایک اور دروازہ کھول دیتا ہے۔ جیسے محمد ﷺ کو خدا تعالیٰ نے خَاتَم النَّبیّن بنایا اور آپ پر تمام شرائع کو ختم کر دیا اور براہِ راست نبوت حاصل کرنے کا دروازہ مسدود قرار دے دیا تو بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے ایک دروازہ کو بند کر دیا مگر خدا نے فوراً ایک اور قسم کے انعام کا دروازہ کھول دیا جو پہلے سے کسی صورت میں کم نہیں۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے بتا دیا کہ رسول کریم ﷺ کی اِتباع میں بھی انسان کو ایسا بلند مقام حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی درجہ میں بڑھ سکتا ہے۔ پھر خدا تعالیٰ نے آپ کو سارے انبیاء کے نام

دیئے اور اس طرح تمام انبیاء کے کمالات کا آپ کو جامع ٹھہرایا۔ اور ایسا انسان جسے تمام انبیاء کے نام دے دیئے جائیں اگر پہلے تمام انبیاء سے بڑا نہیں تو سب کے برابر تو ضرور ہوگا۔

غرض اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ دنیا کو یہ بتا دیا کہ جو رستہ رسول کریم ﷺ کے ذریعہ روکا گیا تھا وہ آپ کی شاگردی میں ایک اور رنگ میں کھول دیا گیا ہے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا قُرب اور اس کا وصال اسی طرح انسان کو حاصل ہوسکتا ہے جیسے پہلے حاصل ہوا کرتا تھا۔ بلکہ رسول کریم ﷺ کی غلامی کی وجہ سے پہلوں سے بھی زیادہ کمالات انسان حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن وہ انسان جو اس نکتہ کو نہیں سمجھتا وہ بجائے اللہ تعالیٰ کے قُرب کیلئے جدوجہد کرنے کے دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی ترقی میں اگر کوئی روک ہے تو وہی جسے اس وقت عزت حاصل ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر جب باغیوں نے حملہ کیا تو آپ نے انہیں یہی کہا کہ میرا قصور سوائے اس کے اَور کچھ نہیں کہ میرا دورِ خلافت ذرا لمبا ہوگیا ہے اور تمہارے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونا شروع ہوگیا ہے کہ یہ کہیں مرتا بھی نہیں کہ اس کی جگہ کوئی اَور لے اور ہم اس کی وجہ سے انعام سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کے دروازے انسان کیلئے ہر وقت کُھلے ہیں اور کوئی خلیفہ اس میں روک نہیں بن سکتا۔ یہی وہ امر ہے جو اللہ تعالیٰ نے **اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ** میں بتایا اور مومنوں کو سمجھایا کہ ہمارے قُرب کا کوئی دروازہ بند نہیں۔ اگر بظاہر تمہیں یہ نظر آتا ہو کہ کوئی دروازہ بند ہوگیا تو تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی اور دروازہ خدا تعالیٰ نے کھول بھی رکھا ہوا ہوگا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے کوئی دروازہ اس وقت تک بند نہیں کرنا جب تک ایک اور دروازہ لوگوں کیلئے کھول نہ دے۔

پھر دوسرا ابتلا لوگوں کو اس لئے آتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں فلاں نعمت فلاں کو کیوں ملی ہمیں کیوں نہیں ملی۔ حالانکہ دُنیوی رُتبے تو جس قدر ہیں وہ محدود ہی ہوں گے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی عُہدہ دے دیا جائے۔ اگر کوئی ملازمت ہو تو خواہ وہ صدر انجمن احمدیہ دے یا مَیں دوں بہرحال محدود افراد کیلئے ہی ہوگی۔ لیکن اگر بیس آدمی آئیں اور ان میں سے ایک کو میں رکھ لوں اور اُنیس کہیں کہ چونکہ ہمیں یہ جگہ نہیں دی گئی اس لئے ہمیں اعتراض پیدا ہوگیا ہے تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔ کیونکہ محدود ملازمتیں محدود افراد کو ہی دی جاسکتی ہیں ہر ایک کو کس طرح دی جاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سورۂ فاتحہ میں اِسی شبہ کا ازالہ کرتا اور فرماتا ہے جب تمہیں کوئی انعام نہیں ملتا تو تم کیوں یہ نہیں سمجھتے کہ تمہارے لئے یہ انعام مقدر نہیں تھا تمہارے لئے کوئی اور نعمت ہوگی جو اللہ تعالیٰ کسی دوسرے وقت تمہیں دے دے گا۔ پس تم جب خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو تو تم اس طرح دعا کرو کہ الٰہی! جو نعمت ہمارے لئے مقدر ہے وہ ہمیں دے۔ تب خدا تمہارا حق تمہیں دے گا اور اس میں تمہارے لئے برکت رکھ دے گا۔ لیکن اگر تم خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت پر قانع نہیں ہوگے اور دوسرے کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاؤ گے تو خدا تم سے اپنی پہلی نعمت بھی چھین لے گا۔ کیونکہ جو شخص اُس کی دی ہوئی نعمت پر راضی نہیں ہوتا وہ مغضوب ہے۔ اس کی مثال قرآن کریم میں ایک اور مقام پر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ عیسائیوں اور یہودیوں کے متعلق فرماتا ہے کہ اگر یہ رسول کریم ﷺ پر ایمان لے آئیں تو ان کیلئے یہ مقدر ہے کہ آسمان سے بھی ان پر نعمتیں اُتریں گی اور زمینی نعمتیں بھی انہیں عطا کی جائیں گی۔ یہود نے یہ سُنا تو انہوں نے کہا ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی نبی آئے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا یہ تو ہو نہیں سکتا لیکن اس گستاخی کی سزا میں جو ہم نے تمہیں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ بھی ہم اب واپس لیتے ہیں۔ تو ہر متقی انسان کیلئے خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام مقرر ہے۔ ورنہ یہ ہو کس طرح سکتا ہے کہ انسان دن رات میں پانچ نمازوں میں اس کے حضور کھڑا ہو اور اُس سے انعام طلب کرے مگر وہ کوئی انعام نہ دے۔

بچپن میں ہم پڑھا کرتے تھے کہ ایک دفعہ ایک لڑکے نے روٹی کا ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لیا اور ایک کتے کو پچکار کر اپنے پاس بلایا۔ کتے نے یہ سمجھا کہ یہ مجھے روٹی کا ٹکڑا کھلانے لگا ہے وہ دُم ہلاتے ہوئے اس کے پاس چلا گیا مگر جونہی کتا اس لڑکے کے قریب پہنچا اس نے ایک ڈنڈا نکال کر جو اس نے پیٹھ کے پیچھے چُھپایا ہوا تھا زور سے اس کے منہ پر مارا اور وہ چُوں چُوں کرتا ہوا بھاگ گیا۔ یہ نظارہ ایک شخص اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ بات بہت ہی بُری معلوم ہوئی اور اس نے اس لڑکے کو سبق سکھانے کیلئے ایک روپیہ اپنی جیب سے نکالا اور کہا کہ میاں بچے یہ روپیہ لے لو۔ وہ دوڑا دوڑا اس کے پاس گیا۔ مگر جونہی اس نے روپیہ پر ہاتھ ڈالا اُس شخص نے زور سے ایک تھپڑ اُس کے منہ پر مارا۔ وہ لڑکا شور مچانے لگ گیا کہ میرے ساتھ دھوکا اور فریب کیا گیا ہے۔ مجھے روپیہ دینے کیلئے بُلایا گیا مگر جب میں پاس پہنچا تو مجھے تھپڑ کھینچ مارا۔ وہ شخص کہنے لگا تُو نے کتے سے کیوں دھوکا کیا تھا اور کیا تجھے شرم نہ آئی تھی کہ تُو نے اسے روٹی کا ٹکڑا دکھا کر بُلایا مگر جب وہ تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے منہ پر زور سے

ڈنڈا مار دیا۔ اب دیکھو ایک بچہ اور نادان بچہ جس میں عقل وخرد نہیں وہ ایک کتے کو روٹی کیلئے بلاتا ہے مگر جب اسے روٹی دینے کی بجائے ڈنڈا مارتا ہے تو انسانی فطرت اس بات کو بُرا مناتی ہے۔ پھر کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا خدا تمہیں اپنے دربار میں بُلا کر تم سے یہی معاملہ کرے گا اور وہ تمہیں ہدایت تو یہ دیتا ہے کہ مجھ سے انعام مانگو مگر جب تم انعام لینے جاؤ گے تو تمہیں خالی ہاتھ پھیر دے گا۔ ایک بچہ کی ایک کتے سے اس قسم کی بات ہوتی ہے تو انسانی فطرت اسے نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ پھر کیسا نالائق وہ انسان ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ خدا تو اُسے اِس لئے بلاتا ہے کہ وہ اسے انعام دے مگر جب وہ جائے گا اور انعام لینے جائے گا تو وہ اسے ٹھوکر مار کر اپنے دربار سے نکال دے گا۔ یہ خیال ہی خود بے ایمانی کی علامت ہے۔ یہ خیال ہی خود کُفر کی علامت ہے، یہ خیال ہی خود ارتداد کی علامت ہے اور جس شخص کے دل میں ایسا خیال پیدا ہوتا ہے وہ اپنے کفر اور اپنے ارتداد اور اپنے نِفاق پر آپ مُہر لگاتا ہے۔ اگر اس کے اندر ایمان ہوتا تو وہ سمجھتا کہ خدا جو مجھے بلا رہا ہے اور اس نے مجھے اپنا ابراہیمی پرندہ بنایا ہے تو اس لئے بنایا ہے کہ مجھے اپنا مقامِ قُرب دے اور اگر ایک دروازہ میرے لئے بند ہے تو کوئی اور دروازہ میرے لئے ضرور کُھلا ہوگا۔ اگر یہ دو باتیں جو سورۂ فاتحہ میں بیان کی گئی ہیں انسان سمجھ لے تو ارتداد اور نِفاق کا پیدا ہونا بالکل بند ہو جائے۔ یہ دو وسوسے ہیں جو دلوں میں پیدا ہوتے اور انسان کے ایمان کو بالکل بہا کر لے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اب میرے لئے انعامات کے دروازے بند ہو گئے۔ پس وہ خیال کرتا ہے کہ جب میرے لئے حصولِ عزت کی اب کوئی راہ باقی نہیں تو آؤ میں نئی انجمنیں بناؤں اور ان کا صدر اور پریذیڈنٹ بن جاؤں۔ پھر انجمنوں کی صدارت پر جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور قوم کو فائدہ پہنچنے کی بجائے نقصان پہنچنے لگ جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو مسلمانوں میں جب بھی کوئی فتنہ پیدا ہوتا ہے اسی بات پر ہوتا ہے کہ جب کوئی نئی انجمن بنتی ہے تو ایک کہتا ہے پریذیڈنٹ مَیں بنوں دوسرا کہتا ہے تُو کیوں بنے میں بنوں گا۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ عزت کے حصول کے طریق محدود ہیں اور اگر عزت حاصل کرنے کا کوئی طریق ہے تو صرف یہ کہ دوسرے کو گرایا جائے اور خود اس کا مقام حاصل کیا جائے۔

پھر کبھی وظیفوں پر جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں کہ فلاں کو کیوں ملا، ہمارے بیٹے کو کیوں نہیں ملا۔ غرض یا تو وہ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ حصولِ مدارج کے راستے بند ہو گئے اور یا یہ خیال کرنے لگ جاتے

ہیں کہ انعامات کی تقسیم میں ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ اور یہ دونوں بے ایمانی کے طریق ہیں اور یہ دونوں کُفر کی چوکھٹ پر انسان کو لے جاتے ہیں اور میں نے جیسا کہ بتایا ہے ان دونوں وسوسوں کا علاج اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ میں بتا دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو سمجھا دیا گیا ہے کہ ان دو چیزوں میں سے کوئی بھی پیدا ہوئی تو تم مغضوب بن جاؤ گے۔ پھر اس کے مقابل کی جو حالت ہوتی ہے وہ ضالّ والی حالت ہوتی ہے یعنی جس کو انعام مل جاتا ہے وہ بعض دفعہ ایسی غلو والی محبت شروع کر دیتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں ضال بن جاتا ہے۔ گویا جس کو کچھ نہیں ملتا وہ ٹھوکر کھا کر مغضوب بن جاتا ہے اور جس کو کچھ ملتا ہے وہ بعض دفعہ ایسی ٹھوکر کھاتا ہے کہ ضال بن جاتا ہے۔ ہاں وہ جو اپنے ہوش وحواس کو قائم رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر سلسلہ کے کاموں میں سے فلاں کام میرے سپرد نہیں کیا گیا یا میرے ہاتھ فلاں عُہدہ کے حصول تک نہیں پہنچ سکے تو یہی میرے لئے مفید ہوگا۔ اور اگر واقعہ میں مَیں کسی انعام کا مستحق ہؤا تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے غیب سے اور سامان پیدا کر دے گا اور اَور راستے میرے لئے کھول دے گا۔ وہ نہ مغضوب بنے گا نہ ضالّ بلکہ دائمی ترقی کرتا چلا جائے گا کیونکہ وہ ہمیشہ یہ دعا مانگتا رہے گا کہ اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ اور ہمیشہ اسے انعامات ملتے رہیں گے۔ اور اگر کسی وقت اس دعا کے باوجود خدا تعالیٰ اسے انعام نہ دے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ خدا تعالیٰ کے خزانے خالی ہیں حالانکہ وہ کبھی خالی نہیں ہوتے۔

غرض غیر محدود ترقیات کیلئے یہ دو یقین اپنے اندر پیدا کرنے نہایت ضروری ہیں۔ اول یہ کہ خدا کبھی انسانی ترقیات کے دروازے بند نہیں کرتا اور اگر بظاہر یہ نظر آتا ہو کہ ترقی کا فلاں دروازہ ہمارے لئے بند ہوگیا تو اس کی جگہ ایک اور دروازہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضرور کُھلا ہؤا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ جب ایک انعام کسی شخص کو نہیں ملتا تو وہ سمجھ لے کہ یہ انعام یقیناً اس کیلئے مقدر نہیں تھا بلکہ کوئی اور انعام اس کیلئے مقدر ہوگا۔ اور اس کیلئے جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں ہدایت کی گئی ہے بغیر کسی تعیین کے خدا تعالیٰ سے دعا مانگے اور اس سے کہے الٰہی! ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں کہ تُو ہمیں اپنے پاس سے وہ انعامات دے جو ہمارے مناسبِ حال ہوں اور جن کو تُو نے ہمارے لئے مقدر کر رکھا ہو۔ اگر ہمارے لئے موسوی جام مقدر ہے تو وہ دے، عیسوی جام مقدر ہے تو وہ دے، داؤدی جام مقدر ہے تو وہ دے، سلیمانی جام مقدر ہے تو وہ دے، رامچندری جام مقدر ہے تو وہ دے، کرشنوی جام مقدر ہے تو وہ دے۔ ہمیں کچھ علم

نہیں کہ ہمارے لئے کونسا جام مفید اور بابرکت ہے اور کونسا جام ہماری قابلیتوں اور طاقتوں کے لحاظ سے ہمارے لئے ضروری ہے۔ علمِ غیب محض تجھ کو ہے اور تجھے ہی ہماری قسمت کا علم ہے۔ پس جو جام تیری نگاہ اور تیرے علم میں ہمارے لئے مفید ہے وہی ہمیں دے اور اپنے فضل اور رحمت سے ہمیں ڈھانپ لے۔ جب تم اس طرح خدا تعالیٰ سے دعا مانگو گے اور اس سے کہو گے کہ اے خدا! جو ہمارا حصہ ہے وہ ہمیں دے۔ تو وہ تمہارا حصہ تمہیں ضرور دے گا۔ لیکن اگر تم اللہ تعالیٰ سے دوسرے کا حصہ مانگو گے تو اس گستاخی کے بدلے نہ صرف یہ کہ دوسرے کا حصہ تمہیں نہیں ملے گا بلکہ تمہارا حصہ بھی جو تم کو مل چکا ہو گا تم سے واپس لے لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ تم کو ہدایت پر رکھے اور غضب اور ضلالت سے بچائے۔ آمین

(الفضل ۱۱ ستمبر ۱۹۳۷ء)

---

۱ الفاتحہ: ۷ ۲ الفاتحہ: ۶ ۳ الفاتحہ: ۷

۴ فاطر: ۲۹

۵ تذکرہ صفحہ ۱۰۔ ایڈیشن چہارم

۶ حٰمٓ السجدۃ: ۴۱۔ بخاری کتاب التفسیر سورۃ الممتحنۃ

۷ اشاعۃ السنۃ جلد ۱۳ نمبر ۱ صفحہ ۳۔۴ مطبوعہ ۱۸۹۰ء

۸ النساء: ۴۹

۹ درثمین اُردو صفحہ ۵۸

۱۰ دُرِثمین فارسی صفحہ ۲۴۸ شائع کردہ نظارت اشاعت ربوہ

۱۱ متی باب ۱۸ آیت ۲۰۔ نارتھ انڈیا بائبل سوسائٹی مرزاپور ۱۸۷۰ء (مفہوماً)